اُصولِ حدیث

غور وفکر کے چند اہم گوشے

’’المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں علمِ حدیث واسماء رجال پر دیئے گئے محاضرات، جن میں اُصولِ حدیث اوراسماء رجال کی تاریخ، اہم کتب اور شخصیات کے تعارف کے علاوہ اس بات پر گفتگو کی گئی ہے کہ احادیث پر عمل کرنے کا مطلب صرف متبادر مفہوم پر عمل کرنا نہیں؛ بلکہ احادیث میں تطبیق کے لئے اس کی تاویل بھی عمل بالحدیث میں شامل ہے، نیز بہت سی صورتوں میں احادیثِ ضعیفہ بھی قابل عمل ہوتی ہیں اور سندِ حدیث کی اہمیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف سند پر احادیث کے معتبر ہونے کا مدار ہے‘‘

مولانا عبیداللہ الاسعدی

طبع اول

۱۴۳۰ھ-۲۰۰۹ء

نام کتاب : اُصولِ حدیث —غور وفکر کے چند اہم گوشے

مؤلف : مولانا عبید اللہ الاسعدی

صفحات : ۱۰۸

کمپیوٹر کتابت : محمد نصیر عالم سبیلی (**العالم** اُردو کمپیوٹر سنٹر، حیدر آباد)

فون نمبر : 9959897621, 9396518670

قیمت :

- المعہد العالی الاسلامی تعلیم آباد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدر آباد
- ہندوستان پیپر امپوریم، مچھلی کمان، حیدر آباد
- کتب خانہ نعیمیہ دیو بند، سہارنپور (یوپی)
- دکن ٹریڈرس، مغلپورہ، نزد پانی کی ٹنکی، حیدر آباد

فہرست مضامین

☆ ☆ ☆ ☆

پیش لفظ

''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کے قیام کو دس سال مکمل ہونے کو ہے، اس ادارہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مختلف علومِ اسلامی کے لئے افرادِ کار تیار کئے جائیں اور دینی مدارس کے فضلاء کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، نیز جدید افکار و نظریات اور عصر حاضر کے رجحانات پر بھی مطلع کیا جائے، اس مقصد کے لئے معہد میں شروع ہی سے کتابی اسباق کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کے فاضل و تجربہ کار اساتذہ اور عصری علوم کے ماہرین کے محاضرات کا سلسلہ جاری ہے، اس سلسلے میں ادارہ کو اپنے آغاز ہی سے جن صاحبِ نظر علماء اور تجربہ کار اساتذہ کا تعاون حاصل ہے، ان میں ایک اس حقیر کے محترم اور محبوب دوست حضرت مولانا عبیداللہ اسعدی (شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ) بھی ہیں، وہ صلاحیت اور صالحیت کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، حدیث وفقہ ان کا خاص موضوع ہے اور ان موضوعات؛ بلکہ بعض دوسرے موضوعات پر بھی عربی اور اُردو میں ان کی متعدد تالیفات منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل علم و نظر کے درمیان انھیں پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

پیش نظر کتاب بھی مولانا موصوف کے فن حدیث سے متعلق چند اہم موضوعات پر معہد میں دیئے جانے والے محاضرات ہیں، ان محاضرات میں علم حدیث سے متعلق ذیلی موضوعات اور ان پر اہم کتابوں کا تعارف تو ملے گا ہی، اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے حدیث کے قبول کرنے اور نہ کرنے اور متعارض احادیث کے درمیان ترجیح قائم کرنے میں علماء عراق —— جن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ روایت و درایت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور نقد حدیث میں اسناد کے دوش بدوش متون اور خارجی قرائن کی شہادت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں —— کے نقطۂ نظر کو بھی واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ان محاضرات کی اشاعت بعض وجوہ کی بنا پر خاصی تاخیر سے ہو رہی ہے، میں مولانا موصوف کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے محاضرات بھی دیئے اور ادارہ کو اس کی اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمائی، اُمید ہے کہ حدیث کے اساتذہ و طلبہ خصوصاً اور دوسرے اصحابِ ذوق عموماً اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان .

۹؍ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — **خالد سیف اللہ رحمانی**

۶؍اپریل ۲۰۰۹ء — (خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

☆ ☆ ☆ ☆

عرضِ مؤلف

فنِ حدیث ایک وسیع فن ہے، یہ ایک سایہ دار شجر طوبیٰ ہے، اس ایک فن سے کتنے ہی فنون وجود پذیر ہوئے ہیں، ہر فن میں درجنوں کتابیں ملتی ہیں، واقعہ ہے کہ محدثین نے حفاظتِ حدیث کی غرض سے علم وتحقیق کے میدان میں اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ دوسری قومیں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں، انھوں نے دنیا والوں کو تحقیق کی نئی نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے، یقیناً ہمارے اکابر محدثین کی یہ گرانقدر خدمات ہمارے لئے باعثِ افتخار ہیں اور ضروری ہے کہ ہم ان کی قدر کریں، حفاظت کریں اور دوسروں تک پہنچائیں، اسی نسبت سے یہ راقم الحروف کے چند محاضرات ہیں، جن کا منشاء طلبۂ حدیث کو اس موضوع کے چند اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا ہے، اور وہ موضوعات یہ ہیں :

۱- حدیث پر عمل — حقیقت اور غلط فہمی :

حدیث پر عمل کی بابت بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ حدیث کے ظاہر لفظ پر عمل کرنا ہی حدیث پر عمل کرنا ہے؛ حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے؛ بلکہ بعض اوقات حدیث پر عمل بذریعہ تاویل، تطبیق اور ترجیح بھی ہوتا ہے، اس مقالہ میں اسی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲- احادیث ضعیفہ اور ان پر عمل :

اس مقالہ میں نمایاں طور پر درج ذیل اُمور زیر بحث آئے ہیں :

مقبول حدیث کی تعریف، شرائط، اقسام، مردود حدیث کی تعریف اور شرطیں، ضعیف حدیث کا صحیح مفہوم، حدیث کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قطعاً قابل رد ہے؛ بلکہ اس کی بعض قسمیں قابل عمل ہوتی ہیں، تعدد طرق اور تلقی بالقبول سے وہ حسن لغیرہٖ کے مرتبہ تک پہنچ جاتی ہیں، تلقی بالقبول کا مفہوم، احکام کے باب میں ضعیف احادیث سے استدلال کرنے کی کسی حد تک گنجائش ہے؟

۳- اصطلاحات حدیث — تاریخ، اہم کتب اور شخصیات :

مصطلحات حدیث کی تاریخ، اہم کتابوں، شخصیات اور ان کی کاوشوں کا اس مقالہ میں مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ہم نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ علماء اُصول فقہ کی کتابوں میں ''مبحث السنۃ'' کے ذیل میں اُصولِ حدیث پر گفتگو کرتے ہیں، خاص طور پر حنفیہ کا زیادہ تر کام اُصولِ فقہ کے ضمن میں ہوا ہے؛ اس لئے راست اُصولِ حدیث میں ہم کو حنفیہ کی مستقل تالیفات بہت کم ملتی ہیں، پھر بھی جن کتابوں کا نام آتا ہے، ہم نے ان کا ذکر کیا ہے، آخر میں اُصولِ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۴- اسناد — اہمیت اور حیثیت :

سند کی اہمیت پر محدثین نے اس حد تک زور دیا ہے کہ اس کو دین کا ایک حصہ قرار دیا گیا، ظاہر ہے کہ دین کی باتوں میں سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کا معیار اور کسوٹی سند ہے؛ لیکن یہ کہنا اور سمجھنا کہ سند ہی سب کچھ ہے درست نہیں ہے؛ بلکہ متن حدیث کی صحت کو درایۃً بھی پرکھا جاتا ہے اور دوسرے قرائن بھی ہیں، جن سے متن حدیث کی صحت کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے — اس مقالہ میں ان ہی باتوں کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

۵- فن اسماء رجال — تاریخ وتعارف اور اہم کتابیں :

اس مقالہ میں فن اسماء الرجال کی ابتداء وارتقاء کی تاریخ، عہد بعہد مختلف انداز سے اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر اور تعارف اور کونسی کتابیں طبع ہوچکی ہیں اور کونسی کتابیں ہنوز مخطوطہ ہیں؟ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ تحریریں وہ ہیں جو ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' میں محاضرات کی شکل میں طلبہ کے سامنے پیش کی گئی تھیں، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے بنیادی مقاصد میں سے ہے کہ مختلف موضوعات پر مختلف ماہرین سے طلبہ کے سامنے محاضرات دلوائے جائیں؛ تاکہ ان کا ذہنی اُفق وسیع اور فکری سطح بلند ہو، اور وہ فی الجملہ ہمہ جہت معلومات سے آراستہ ہوں، ماشاء اللہ یہ سلسلہ اس کے قیام کے سال ہی سے جاری ہے اور اسی مقصد کے لئے شروع ہی سے معہد میں میری حاضری کا سلسلہ ہے، اس کا ایک محرک یہ بھی ہے کہ میرے محبوب دوست حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب زید مجدہ اس ادارہ کے بانی اور ذمہ دار ہیں، جن سے ذاتی طور پر اور حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی نسبت سے بھی خصوصی تعلق اور لگاؤ ہے؛ بلکہ کہنا چاہئے کہ ہم سب ایک ہی علمی خانوادہ کے افراد ہیں۔

میں المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، اس کے ذمہ داران خصوصاً رفیق گرامی مولانا رحمانی صاحب کا تہہ دل سے شکرگذار ہوں کہ انھوں نے اپنے وقیع اور فعال ادارہ میں محاضرہ کے لئے مدعو بھی کیا اور ان محاضرات کو زیورِ طبع سے آراستہ بھی فرمایا، دل سے دُعاء گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو نظر بد سے بچائے، حاسدوں کے حسد سے محفوظ رکھے اور ہمہ جہت ترقی عطا فرمائے۔

وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین .

عبید اللہ الاسعدی

(جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ، یوپی)

☆ ☆ ☆ ☆

حدیث پر عمل — حقیقت اور غلط فہمی

بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا اصطلاحی اور واقعی مفہوم متعین کرنے میں کافی خلل و خبط ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں غلط فہمیاں اور بدگمانیاں اور شدید اختلافات بھی جنم لیتے ہیں، مثلاً فقہیات میں اصحاب الرائے اور اہل الرائے، اہل حدیث اور اصحابِ حدیث وغیرہ اسی طرح ''عمل بالحدیث'' بھی اسی قسم کے الفاظ میں سے ہے، جن کے معنی کی تعیین میں اختلاف ہے۔

میں اس موقع سے عمل بالحدیث اور عاملین بالحدیث کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں؛ اس لئے کہ بہت سے حضرات نے اس کا ایک محدود مفہوم متعین کیا ہے اور چند معروف مسائل وہ ہیں، جن میں اہل الرائے اور اہل الحدیث کا اختلاف معروف ہے، جس کسی کی زندگی میں یہ بات پائی گئی کہ وہ رفع یدین کرتا ہے، آمین بالجہر پر عامل ہے یا امام کے پیچھے قرأت پر اس کا عمل ہے، تو اس کے لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ''اہل حدیث'' حضرات سے تعلق رکھتا ہے؛ بلکہ ان میں سے ایک دو مسئلہ کی وجہ سے آدمی کے فقہی مذہب اور فقہی نسبت کو طے کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح عمل بالحدیث کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ظاہر نص یعنی الفاظِ حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرنا ہی عمل بالحدیث ہے؛ لیکن محققین علماءِ اُمت کی صراحت کی رو سے یہ دونوں باتیں نادرست ہیں۔

عمل بالحدیث کا مفہوم عام علماء کے نزدیک بہت وسیع ہے، ظاہر نص وظاہر مفہوم پر عمل اس کی ایک جہت و پہلو ہے، ورنہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کسی حدیث کے علم میں آنے پر علماءِ فن کے مقرر کردہ ضوابط کے مطابق، حدیث کے ساتھ معاملہ کرنا، اب خواہ نوبت من وعن اس پر عمل کی آئے یا کچھ تفصیل کے ساتھ یا یہ کہ اس کو چھوڑ ہی دیا جائے، فی الجملہ یہ صورتیں سب اس کے تحت آتی ہیں۔

اس بابت سب سے پہلے تو میں فن حدیث کے معروف ومعتمد عالم ومحقق کی مایہ ناز اور مقبول ومتداول کتاب کی بات نقل کرتا ہوں، یعنی حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کا وہ بیان جو ''نخبۃ الفکر'' کی شرح ''نزہۃ النظر'' میں آیا ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

> جو حدیث مقبول وقابل عمل واحتجاج قرار پاتی ہے، اس کی دو اقسام ہیں: ایک معمول بہ (جس پر عمل ہوتا ہے) اور دوسری غیر معمول بہ (جس پر عمل نہیں کیا جاتا)؛ کیونکہ مقبول حدیث کا معاملہ بھی یہ ہوتا ہے کہ کبھی اس کے خلاف کوئی دوسری روایت نہیں پائی جاتی، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسی پر عمل کیا جاتا ہے؛ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی قابل اعتماد کوئی روایت اس کے خلاف بھی پائی جاتی ہے اور دونوں ہی کی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ عمل کا تقاضا کرتی ہیں، کسی ایک پر یوں ہی بغیر کسی واضح بنیاد کے عمل نہیں کیا جاسکتا تو اس صورت میں غور وفکر کے بعد یا تو یہ طے ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کا زمانہ دوسرے کے زمانہ سے مقدم ہے؛ اس لئے ایک یعنی پہلی تو منسوخ ہے کہ شریعت نے اس پر عمل سے منع کر دیا ہے اور دوسری یعنی بعد کی ناسخ ہے کہ اب پہلی جگہ اس پر عمل کا حکم دیا گیا ہے۔

یا پھر یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ایک قرائن کی وجہ سے مرجوح اور دوسری راجح ہو اور عمل راجح پر ہی کیا جائے گا، مرجوح عمل کے حق میں کمزور قرار پاتی ہے اور اس پر عمل کی اجازت نہیں ہوتی یعنی راجح کی حیثیت حدیث صحیح ومقبول کی اور مرجوح کی حیثیت ضعیف وغیر معتبر کی قرار پاتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق وتوفیق کی شکل اختیار کی جائے اور یہ مانا جائے کہ دونوں حدیثیں الگ الگ مختلف حالات کے لئے ہیں، یا قید وتفصیل کے ساتھ دونوں پر ہی عمل ہوتا ہے، یا ایک میں توجیہ ہوتی ہے اور ایک کو ظاہر پر رکھا جاتا ہے۔

اور جب اس تیسری صورت کا اختیار کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا تو دونوں کے حق میں عمل کی نسبت سے توقف کیا جاتا ہے اور دونوں میں سے کسی پر عمل نہیں کیا جاتا، اس وقت تک جب تک کہ پچھلی تینوں صورتوں میں سے کوئی ایک واضح ہوکر سامنے نہ آئے۔(۱)

مذکورہ بالا تینوں صورتیں حدیث پر عمل کہلاتی ہیں؛ حالانکہ تیسری صورت میں الفاظ حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل نہیں ہوتا اور یہی نہیں؛ بلکہ پہلی و دوسری صورتوں میں دوسری حدیث جس کو منسوخ یا مرجوح قرار دیا گیا، اس کو منسوخ یا مرجوح قرار دینا بھی ایک قسم کا اس پر عمل ہے۔

اس بابت امام ترمذی علیہ الرحمہ کی کتاب ''العلل الصغیر'' کی ایک عبارت کے تحت بہت اچھی تفصیل ووضاحت آئی

شروح ترمذی میں کوئی گفتگو آئی ہے، وہاں امام ترمذی نے اپنی علل صغیر میں اپنی کتاب کے متعلق ایک قاعدہ ذکر کیا ہے؛ بلکہ اس کو شروع ہی کیا ہے اس بات سے کہ میری کتاب (جامع) میں آنے والی ہر حدیث پر کسی نہ کسی مجتہد کا عمل ہے ،مگر دو حدیثیں ایسی ہیں کہ ان پر کسی کا عمل نہیں ہے :

(۱) نزہتہ ونخبہ، ایسے تعارض کی صورت میں نسخ وجمع وغیرہ کے اختیار کرنے میں کیا ترتیب ہوگی؟ اس میں کچھ اختلاف ہے؛ لیکن اس میں اختلاف نہیں ہے کہ تعارض کے حل کی شکلیں یہی ہیں۔

ایک دو نمازوں کے درمیان جمع جب کہ کسی طرح کا کوئی عذر و سبب موجود نہ ہو، دوسری جو شخص پانچویں مرتبہ شراب پئے اس کا قتل۔

امام ترمذیؒ کے اس ارشاد پر شراح ترمذی نے کتاب العلل میں، نیز کتاب (جامع) کے اندر دونوں حدیثوں کے مواقع میں گفتگو کی ہے اور دوسرے حضرات نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں کی نسبت سے ترک عمل کا دعوی محل نظر؛ بلکہ نادرست ہے، اس موقع سے میں اس بابت ترمذی کی مشہور شرح ''تحفۃ الاحوذی'' سے ایک عبارت کی نقل پر اکتفا کرتا ہوں؛ کیوں کہ صاحب تحفہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری علیہ الرحمہ کا شمار برصغیر کے طبقۂ اہل حدیث کے ممتاز علماء ورجال میں ہوتا ہے۔

جامع ترمذی کتاب الصلاۃ باب ''ماجاء فی الجمع بین الصلاتین فی الحضر '' کے تحت مولانا عبدالرحمٰن صاحب حدیث مذکور پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

صاحب ''دراسات اللبیب'' فرماتے ہیں :

> امام ترمذی کا یہ ارشاد عجیب ہے، وجہ یہ ہے کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اگر کسی کے حق میں یہ کہا جائے کہ فلاں حدیث پر اس کا عمل نہیں اور اس کو اس نے چھوڑ دیا ہے تو یہ بات اسی وقت اس کے لیے تسلیم کی جاتی ہے، جب کہ وہ اس حدیث کا کوئی جواب نہ دے اور نہ ہی اس کا کوئی محمل ذکر کرے؛ لیکن اگر وہ کوئی جواب دے یا محمل بیان کرے تو وہ حدیث پر عمل کرنے والا ہوگا۔
>
> ہاں اگر امام ترمذی کا مطلب یہ ہو کہ ان دونوں حدیثوں کے ظاہر پر کسی کا عمل نہیں ہے، جس کا عمل ہے تاویل وتوجیہ کے ساتھ ہے تو بھی امام ترمذی کا ارشاد بالا کہ میری کتاب کی دو حدیثوں کے ماسوا بقیہ سب معمول بہ ہیں متاثر ہوگا؛ اس لیے کہ بقیہ کا معاملہ بھی یہ نہیں ہے کہ سب کے ظاہر پر اور من وعن لفظی مفہوم پر عمل ہو کسی اور طرح کی توجیہ وتاویل سے کام نہ لیا گیا ہو، پھر یہ کہ بعض علماء کا عمل اس حدیث کے ظاہر کے موافق ہی ہے۔

اس کے بعد صاحب تحفہ فرماتے ہیں :

> میرے نزدیک بھی بات وہی ہے جو صاحب دراسات نے فرمائی۔(۱)

صاحب دراسات مخدوم محمد معین سندھی (م:۱۱۶۱ھ) بھی مولانا مبارکپوری وغیرہ کے ہم مزاج ہیں جیسا کہ دراسات سے مجموعی طور پر واضح ہوتا ہے، اگر چہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے کتاب ''دراسات اللبیب'' کچھ عجیب کتاب ہے،(۲) انہوں نے امام ترمذی کے مذکورہ بالا ارشاد پر جو بحث کی ہے اس کو ان لفظوں پر ختم کیا ہے :

> اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ اُمت کے کسی عالم نے اس پر عمل نہیں کیا ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ علماء نے اس کا اعتبار نہیں کیا (اور اس پر سرے سے عمل نہیں کیا)؛ کیونکہ رخصت کی روایتوں کو اپنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان (احادیث کو ثابت اور) رخصتوں کو مباح و جائز مانا جائے ؛ اگر چہ علماء کی طرف سے ان پر کبھی عمل نہ ہو ، جیسا کہ سمجھ داروں پر مخفی نہیں ؛

(۱) تحفۃ الأحوذی:۱/۴۶۱،۱۰/۴۶۲-۴۶۳، ترمذی کی اس عبارت سے متعلق مزید واقفیت کے لیے ملاحظہ ہو: سنن ترمذی، تعلیقات احمد شاکر:۱/۳۵۶،۳۵۸، الأجوبۃ الفاضلہ، تعلیقات الشیخ عبد الفتاح:۶۹-۱۷، نیز دراسات للبیب:۲۷۵-۲۸۹ (۲) اس کے لیے خصوصیت سے، مولانا

عبدالرشید نعمانی کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ طبع شدہ اڈیشن کا آخری حصہ ملاحظہ کیا جائے۔

اس لیے اس حدیث پر بھی ترمذی کے اس حکم کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کو علماء میں سے کسی نے اختیار نہیں کیا ہے۔(۱)

خلاصہ یہ کہ ''عمل بالحدیث'' کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ کسی حدیث کے ظاہر کے مطابق ہی عمل کیا جائے اور یہ کہ اس پر عمل واقعی ضرور پایا جائے؛ بلکہ اس میں وسعت ہے اس حد تک کہ کسی حدیث کے علم میں آنے پر فن کے ضوابط وقواعد کے موافق اس کی بابت جو فیصلہ کیا جائے وہ حدیث پر عمل کہلائے گا، خواہ فیصلہ اس کے ظاہر پر ہو یا نسخ وترجیح کا ہو یا توجیہ وتطبیق کا؛ بلکہ کوئی بات سمجھ میں نہ آسکے تو، توقف بھی ایک قسم کا عمل ہے۔

اب آیئے اس پہلو پر کہ اُمت نے جو فقہی مذاہب ومسالک اختیار کررکھے ہیں خواہ تقلید ہو یا عدم تقلید، (ہمارے عرف میں اہل حدیث حضرات کا مسلک)ان میں سے کسی کی طرف نسبت کے لیے کیا یہ کافی ہے کہ ایک عالم محقق ایک دو یا چار مسئلوں میں اسی مسلک کے موافق رائے وعمل رکھتا ہو؟ اگرچہ یوں اس کی نسبت کسی دوسرے مسلک کی طرف معروف ہو؛ بلکہ اس کی زندگی کے عام معاملات ومعمولات کسی دوسرے مسلک کی جزئیات کے مطابق انجام پاتے ہوں؟

اس بابت بھی مختلف مسالک ومذاہب کے علماء محققین کی رائے یہ سامنے آتی ہے کہ آدمی جس مذہب کی طرف قدیم نسبت رکھتا ہے، خواہ کسی وجہ سے ہو یہ نسبت چند مسائل میں مذہب کے خلاف رائے وتحقیق اور عمل کے اپنانے واختیار کرنے کی وجہ سے ختم نہیں ہوتی، جب تک کہ وہ باقاعدہ طور پر اُصول وفروع میں سابق مذہب کو چھوڑ کر اپنے آپ کو کسی دوسرے مذہب کا متبع اور پابند نہ بنائے، جیسا کہ ہم علامہ شوکانی وغیرہ کے متعلق پڑھتے ہیں۔

اس بابت تفصیل کے لئے '' الفرقان '' شاہ ولی اللہ نمبر میں مولانا محمد یوسف صاحب

(۱) دراسات اللبیب:۲۸۹، وتحفة الأحوذی:۱۰/۴۶۳

بنوری علیہ الرحمہ کا مقالہ ملاحظہ کیا جائے جو بڑا ہی بصیرت افروز ہے، میں اس موقع سے چند ایسے حضرات کی تصریحات پر اکتفا کرتا ہوں، جو ہم جیسے مقلدوں کا ذہن ومزاج نہیں رکھتے تھے اور تقلید واجتہاد وتحقیق مسائل میں کشادہ ذہن رکھتے تھے۔

نواب صدیق حسن خان صاحب ''الحطة فی ذکر الصحاح الستة'' میں فرماتے ہیں :

> اپنے موقع پر یہ بات ثابت ہے کہ ایک آدمی اگر کتاب وسنت کے ظواہر پر عمل کرتا ہے، یا جس امام کی وہ (عامۃً) تقلید وپیروی کرتا ہے، (کسی مسئلہ میں) اس کو چھوڑ کر دوسرے امام کی اتباع کرلے تو اس کا یہ طرز عمل اس کے اپنے امام ومذہب کے پیرو ومتبع ہونے سے مانع نہیں ہوتا، جیسا کہ بہت سے کم علم فقہاء خیال کرتے ہیں اور ہمارے زمانے کے ایمان کی حلاوت سے محروم متقشف فقہاء بکتے پھرتے ہیں۔(۱)

اسی بنا پر نواب صاحب نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے مایہ ناز شاگرد ابن القیم علیہما الرحمہ کو حنابلہ اور امام دہلوی شاہ ولی اللہ اور ان کے جملہ اخلاف کو بشمول حضرت شاہ شہید حنفیہ میں ذکر کیا ہے۔(۲)

ابن تیمیہ وابن القیم کے متعلق فرماتے ہیں :

> یہ دونوں حضرات بڑے مقتدا، عالم وعامل، ثقہ ومتقی اور حنابلہ کے افاضل علماء میں سے تھے۔(۳)

نواب صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے اخلاف بالخصوص شاہ اسماعیل شہید کے سلسلے میں اس بابت کچھ تفصیل سے کلام فرمایا ہے؛ چنانچہ اولاً تو فرماتے ہیں :

(۱) الحطة:۱۷ (۲) الحطة:۱۷ (۳) الحطة:۷۴

> لوگوں نے ان دونوں کے حق میں بہت غلو کررکھا ہے اور ان کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں، جو ان کے حق میں مناسب نہیں ہیں
>
> ۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :

> ہم ان کے طرز عمل کا خلاصہ ذکر کرتے ہیں، جس سے حقیقت واقعہ پورے طور پر واضح ہوجائے گی۔

امام دہلوی شاہ ولی اللہ صاحب کے فقہی مسلک کی بابت فرماتے ہیں :

امام ولی اللہ دہلوی نے فقہیات کے باب میں اپنا طریقہ یہ رکھا ہے کہ وہ مجتہدات کو (یعنی تمام وہ مسائل اجتہادیہ جو ائمہ سے منقول ہیں، ان کو) کتاب وسنت پر پیش کرتے ہیں اور ہر باب ومسئلہ میں انہیں دونوں سے تطبیق وموافقت تلاش کرتے ہیں، پھر جو رائے ان کے (یعنی کتاب وسنت کے) موافق ہو، اسے اختیار فرماتے ہیں اور جو موافق نہ ہو، اسے ترک فرماتے ہیں، خواہ کوئی مسئلہ ہو اور کسی بھی مجتہد ومستنبط سے منقول ہو۔

اس کے بعد کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں :

امام دہلوی کا یہ طریقۂ کار پورے طور پر مذہب حنفی (پر ہی عمل) ہے اور...... یہ حضرات حنفیہ کے علوم کا خزانہ اور ملت ابراہیمیہ کے مقتدا ہیں۔(۱)

نواب صاحب اپنی ایک دوسری مایہ ناز کتاب 'اتحاف النبلاء' میں فرماتے ہیں :

ان حضرات کا خاندان علوم حدیث اور فقہ حنفی کا خانوادہ ہے ۔ (۲)

(۱) الحطة فی ذکر الصحاح الستة:۷۱ (۲) اتحاف النبلاء :۲۹۷

اس موقع سے سید احمد شہید علیہ الرحمہ کا وہ بیان بھی نقل کردینا مناسب ہے، جو ان کے بعض مکاتیب میں ان حضرات کے فقہی مسلک ومشرب کی وضاحت کے سلسلے میں آیا ہے اور جس کا مقصد غلط فہمیوں کو بھی دور کرنا تھا اور خوش فہمیوں کو بھی، سید صاحب فرماتے ہیں :

پشت ہا پشت سے اس فقیر کا مذہب حنفی ہے اور اس کے تمام اقوال وافعال حنفیہ کے اصول وقواعد پر ہی منطبق ہیں، شاید ہی دو ایک اقوال ان کے اصول سے باہر ہوں اور اگر کبھی غلطی سے کوئی مخالفت ہو جاتی ہے تو اپنی غلطی کا اعلان واعتراف کر کے صحیح صورت کو اختیار کیا جاتا ہے۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ ہر مذہب میں مقلدین کا طریقۂ عمل اور ہوتا ہے اور حضرات محققین کا کچھ اور، روایات کی ایک دوسرے پر ترجیح، قوت دلیل پر نظر، اسلاف سے منقول بعض اقوال کی توجیہ، کتابوں میں مذکورہ مسائل کی اُصول واحادیث سے تطبیق وغیرہ مختلف اُمور ہمیشہ سے اہل توفیق وتحقیق کا مشغلہ رہا ہے، اس کی وجہ سے وہ مذہب سے باہر نہیں ہوسکتے؛ بلکہ ان کو تو مذہب کا لب لباب اور خلاصہ سمجھنا چاہئے۔(۱)

مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں :

اگر کوئی حنفی کسی مسئلہ میں اپنے ائمہ کے قول کو محض اس وجہ سے ترک کردے کہ امام کے قول کے خلاف دلیل قوی پاتا ہے تو اس کی وجہ سے وہ تقلید کے دائرہ سے باہر نہیں ہوگا؛ بلکہ یہ تو عین تقلید ہے، دیکھئے عصام بن یوسف نے رفع یدین کے مسئلے میں

(۱) مکاتیب سید احمد شہید:۲۱۶-۱۱۵

امام ابوحنیفہ کے مذہب کو چھوڑ دیا تھا، پھر بھی وہ احناف میں ہی شمار ہوتے ہیں، اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے، جسے ہمارے اصحاب میں سے بعض معتمد اہل فتاوی حضرات نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے ایک دن کنویں کی طہارت کے مسئلے میں امام شافعی کے قول پر عمل کیا، یعنی محض قلتین پر پاکی کا حکم لگایا۔(۱)

پھر محض دو چار مسئلوں کی وجہ سے ایک مذہب کے بجائے دوسرے مذہب کی طرف انتساب ونسبت میں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ کسی مذہب کا امتیاز صرف دو چار مسئلے اور خاص طور پر جزئیات نہیں؛ بلکہ اصل چیز تو اس سلسلے کے اُصول ہیں اور ان پر مبنی کافی وسیع مقدار میں فروع۔

رفع یدین، قرأت خلف الامام، آمین بالجہر: یہ ایسے مسائل ہیں جو شوافع وحنابلہ اور ہمارے یہاں کے اہل حدیث حضرات میں مشترک ہیں تو اگر کوئی عالم مثلاً حنفیت کی طرف نسبت کے ساتھ ان میں سے کسی کو اپنائے یا ان تینوں کو تو اُسے متعین طور پر ''اہل حدیث یا عامل حدیث'' ہی کیوں کہا جائے؟ جب کہ یہ

مسائل ان کا امتیاز نہیں۔

پھر مزید یہ کہ یہ مسائل اور اس طرح کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں کہ جن میں اگر چہ مذہب کا معروف پہلو کچھ اور ہو؛ لیکن مذہب کے بعض ائمہ اور ممتاز فقہاء کے یہاں ترجیح واختیار دوسرے پہلو کو ہوتا ہے، مثلاً مذکورہ تینوں مسائل فقہ حنفی کے قول معروف کے مطابق ممنوع ومرجوح ہیں؛ لیکن اس کے باوجود یہ مسائل بعض ائمہ احناف وعلماء حنفیہ کے یہاں معمول بہا ہیں اور وہ فی الجملہ ان کی ترجیح کے قائل ہیں تو اگر کوئی حنفی عالم ان مسائل کو اپنائے تو اس کا یہ عمل خود اس کے مذہب کے تحت کیوں نہ شمار کیا جائے؟

(۱) الفوائد البهية:۱۵

ابھی مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی کی تحریر میں آیا ہے کہ عصام بن یوسف رفع یدین کے قائل تھے اور ان کا شمار ممتاز علماء حنفیہ میں ہوتا ہے اور مولانا عبد الحیٔ صاحب نے ''التعليق الممجد'' میں فرمایا ہے :

> ہماری رائے یہ ہے کہ رفع یدین سنت مؤکدہ نہیں ہے کہ اس کے ترک پر ملامت کی جائے؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رفع یدین کا ثبوت ہی زیادہ راجح ہے۔(۱)

آمین بالجہر میں بھی ممتاز علماء حنفیہ کی ایک جماعت جہر کو راجح مانتی ہے، یا اس کے رجحان کا میلان رکھتی ہے، اگر چہ کچھ توجیہ کے ساتھ ہو، چنانچہ مولانا عبد الحیٔ صاحب فرماتے ہیں :

> انصاف یہ ہے کہ دلیل کی رو سے جہر قوی ہے اور ابن امیر الحاج نے اس طرف اشارہ کیا ہے؛ کیونکہ انہوں نے اس بابت گفتگو کے بعد کہا ہے، ہمارے مشائخ نے مذہب کے قول کی ترجیح میں ایسی باتیں ذکر کی ہیں، جو تامل سے خالی نہیں؛ اسی لئے ابن ہمام نے کہا ہے کہ اگر میں اپنی طرف سے فیصلہ کرتا تو یوں کہتا کہ خفض سے مراد بغیر چلائے ہوئے کہنا اور جہر سے مراد ہے آواز کو اٹھا کر بلند کر کے (یعنی سنا کر) کہنا،(۲) سعایہ میں مولانا عبدالحیٔ صاحب نے اور زیادہ کھلے الفاظ میں جہر کی ترجیح وصحت کو ذکر کیا ہے۔

اور جہاں تک سوال ہے قرأت خلف الامام کا، تو اس بابت تو حنفیہ کے یہاں کسی نہ کسی درجہ میں توسع ابتدا سے ہی منقول چلا آرہا ہے، میں کسی تفصیلی بات کے نقل کرنے کے

(۱) التعليق الممجد:۸۹ (۲) التعليق الممجد:۱۰۳

بجائے مولانا تقی صاحب عثمانی کے ایک تاثر کی نقل پر اکتفا کرتا ہوں، مولانا فرماتے ہیں :

> حنفیہ کے نزدیک قرأت فاتحہ خلف الامام صلوات جہریہ اور صلوات سریہ دونوں میں مکروہ تحریمی ہے، چنانچہ حنفیہ کی ظاہر روایت یہی ہے، البتہ امام محمد سے ایک روایت یہ ہے کہ قرأت فاتحہ خلف الامام صلوات جہریہ میں تو مکروہ اور سریہ میں مستحب یا کم از کم مباح ہے؛ اسی کو علامہ عبدالحیٔ لکھنوی اور بعض دوسرے متاخرین حنفیہ نے اختیار کیا ہے اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب کا میلان بھی اسی جانب معلوم ہوتا ہے۔(۱)

معارف السنن جو علامہ کشمیری کے امالی کا مجموعہ ہے، اس میں امام محمد کی روایت اور اس کے ثبوت سے متعلق کافی تفصیل آئی ہے۔

بہر حال اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ کسی ممتاز عالم باحیات یا باوفات کے دو ایک معمولات کو لے کر یہ تاثر قائم کرنا کہ ان کا مسلک تو فلاں طبقہ ومشرب کا تھا یہ درست نہیں ہے، یہ بہت چھوٹی بات ہے اور اس سلسلے کے بڑوں نے اس کی تردید کی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

(۱) درس ترمذی:۲/۴۷

احادیثِ ضعیفہ اوران پر عمل

آج کی نشست میں ہماری گفتگو اس بابت ہوگی کہ جس حدیث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے، عمل میں اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ اور ہمارا اس کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے؟ نیز یہ کہ ضعیف کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ ہر حال میں مردود اور مردود کے حکم میں ہوتی ہے یا کچھ اور؟

لیکن ہم گفتگو یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ کتاب وسنت تمام احکام شرعیہ کے مصادر ہیں، کتاب اللہ کا تو ایک ایک جزء ولفظ اور ہر آیت وکلمہ قطعی ہے، اس کی بابت تو یہ گفتگو ہی بے معنی؛ بلکہ جسارت ہے کہ اس میں کیا حجت ہے اور کیا نہیں؟

البتہ احادیث کا معاملہ یہ ہے کہ تمام احادیث ثبوت میں ایک درجہ نہیں رکھتیں؛ اس لیے ان کی بابت اس بحث وتحقیق کی ضرورت رہتی ہے کہ کون سی حدیث لائق احتجاج وقابل استدلال ہے اور کون سی نہیں اور اس میں سے کونسی کہاں کہاں حجت ہے اور کہاں نہیں؟

اس بنیاد پر محققین فن نے جو گفتگو فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ احتجاج وعدمِ احتجاج کے اعتبار سے بنیادی طور پر احادیث کے دو حصے ہیں، یعنی ان احادیث کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کو محدثین کے یہاں ''اخبار آحاد'' کہتے ہیں: ایک احادیثِ مقبولہ اور دوسری احادیثِ مردودہ (یعنی غیر مقبولہ)۔

جن احادیث میں قبولیت کے لیے مطلوب جملہ شرائط موجود ہوں، وہ مقبول کہلاتی ہیں اور جن احادیث میں قبولیت کی شرائط پایۂ ثبوت کو نہ پہنچیں وہ مردود وغیر مقبول کہلاتی ہیں۔

حدیث کی مقبولیت واعتبار کی شرائط معروف ہیں، یعنی راوی کا عادل ہونا، ضابط ہونا، سند کا متصل ہونا اور حدیث (یعنی سند ومتن دونوں) کا ہر قسم کی علت سے خالی ہونا۔

نخبہ وغیرہ کی صراحت کے مطابق پانچویں شرط یہ ہے کہ حدیث ہر قسم کے شذوذ سے بھی خالی ہو؛ لیکن حدیث کی مقبولیت کے لیے علی الاطلاق اس امر کا اعتبار واشتراط محل نظر ہے اور متفق علیہ چار ہی شرطیں ہیں، شذوذ سے خالی ہونے کا تذکرہ حافظ صاحب نے اہتمام سے کیا ہے اور بعد کے لوگوں نے چونکہ عموماً نخبہ وحافظ صاحب پر اعتماد کیا ہے؛ اس لیے یہ چیز کچھ عمومی طور پر معروف ہوگئی ہے؛ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، ''شاذ'' جو مستقل ایک قسم ونوع ہے، اس سے متعلق تفصیلات کا مطالعہ کیجئے تو خود حافظ صاحب وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر شذوذ یا ہر اختلاف وزیادتی عیب اور قابل انکار نہیں ہے؛ بلکہ شذوذ وغیرہ کے باوجود حدیث کو صحیح یا حسن قرار دیا جاتا ہے(۱) خود حافظ ابن حجرؒ سے منقول ہے :

والمنقول عن أئمة الحديث المتقدمين كإبن مهدي ويحيىٰ القطان وأحمد وابن معين وابن المديني والبخاري وأبي زرعة وأبي حاتم والنسائي والدارقطني : اعتبار الترجيح فيما يتعلق بالزيادة المنافية بحيث يلزم من قبولها ردّالرواية الأخرى . (۲)

علامہ ذہبیؒ نے حدیثِ صحیح کی تعریف میں فرمایا ہے :

هو ما دار على عدل متقن واتصل سنده .

اس کے بعد فرماتے ہیں :

وزاد أهل الحديث سلامته من الشذوذ والعلة ، وفيه

(۱) قواعد فی علوم الحدیث:۱۰۲

(۲) النکت علی ابن الصلاح:۶۵۴،تدریب الراوی:۱/۶۵-۲۴۶

نظر على مقتضى نظر الفقهاء ، فإن كثيرا من العلل يأبونها . (۱)

علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں :

ومن المسائل المختلف فيها —— بين المحدثين والفقهاء —— ما إذا أثبت الراوی عن شیخه شیئا فنفاه من هو أحفظ، أو أكثر عددا، أو أكثر ملازمة منه، فإن الفقيه و الأصولي يقولان : المثبت مقدم على النافی، فيقبل والمحدثون يسمونه شاذا؛ لأنهم فسّروا الشذوذ المشترط نفيه هنا، بمخالفة الراوی فی روايته من هو أرجح منه. (۲)

اس بابت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مقدمہ ''فتح الملہم'' میں لمبی اور محققانہ بحث فرمائی ہے اور اس کے اخیر میں فرمایا ہے :

فالإنصاف أن الحكم بالشذوذ من المحدثين لما كان مرجعه الترجيح من حيث كثرة العدد أوقوة الحفظ ونحوهما لايستلزم كون الحديث شاذا مردوداً عند غيرهم من الفقهاء غير محتج به فی الأحكام. (۳)

مقدمہ ابن الصلاح وغیرہ میں بھی اس انداز کی صراحتیں موجود ہیں۔(۴)

بہر حال جس حدیث کے اندر مقبولیت کی شرائط کا تحقق نہ ہو سکے اس کو مردود کہتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ کی صراحت کے مطابق مردود کا اصل مفہوم یہی ہے، پھر خواہ یہ صورت پائی جائے کہ مقبولیت کے لیے مطلوبہ اُمور کے خلاف کا ثبوت پایا جائے یا یہ صورت ہو کہ نفیاً یا

(۱) الموقظة:۲۴ (۲) فتح المغیث:۱/۱۳

(۳) فتح الملهم:۱/۵۱،نحوہ فی فتح المغیث:۱۰ (۴) مقدمہ علوم الحدیث:۴۰

اثباتاً کسی طرح ان کا ثبوت نہ ہو، البتہ یہ تفصیل کی گئی ہے کہ اگر خلاف کا ثبوت ہو تو حدیث بلاشبہ مردود ہے اور اگر کسی پہلو کا ثبوت نہ ہو تو حدیث عین مردود تو نہیں ہوگی؛ البتہ مردود کے مثل ہوگی، کہ جب تک کسی طرح اس کے حق میں قبولیت کے کسی درجہ کا ثبوت وتحقق نہ ہو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ اس کے حق میں توقف کیا جائے گا اور تحقیق وجستجو جاری رہے گی۔

واضح رہے کہ حدیثِ مقبول کے مقابلے میں جس حدیث کو مردود یا غیر مقبول کہتے ہیں، اسی کا دوسرا نام ضعیف ہے، ضعیف و مردود دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، جیسا کہ مصطلح الحدیث کی تمام کتب وتفاصیل سے ظاہر ہے کہ ضعیف کے تحت ہی موضوع وغیرہ جملہ اقسام کو ذکر کیا جاتا ہے، بالخصوص منہج النقد اور تیسیر مصطلح الحدیث کی عبارتیں بڑی واضح ہیں(۱)، بس یہ فرق ہو سکتا ہے کہ ضعیف کے مفہوم میں بایں معنی عموم ہے کہ اس کے تحت آنے والی بعض اقسام بعض صورتوں میں سہی کچھ نہ کچھ گنجائش رکھتی ہیں، جیسے مرسل و معلق وغیرہ، جب کہ موضوع و متروک وغیرہ میں کچھ گنجائش نہیں ہوتی، یہ سرے سے ردو مردود ہوتی ہیں۔

حدیثِ مقبول کی اصولی طور پر چار اقسام کی جاتی ہیں اور اصلاً تو دو ہی ہیں: ایک صحیح اور دوسری حسن اور صحیح وحسن دونوں کے اندر جملہ شرائطِ قبولیت کا پایا جانا ضروری ہے، بس معروف (۲) اصطلاح کے مطابق فرق یہ ہے کہ راوی کے ضبط میں قوت وضعف کی بنیاد پر حدیث کو صحیح (بصورتِ قوت) اور حسن (بصورتِ ضعف) کہا کرتے ہیں؛ لیکن ضبط کا پایا جانا حسن میں بھی ضروری ہے اگرچہ کم درجہ کا ہو اور عدالت نیز اتصالِ سند تو ضروری ہے ہی، پھر صحیح کی دو اقسام ہیں: صحیح لذاتہٖ اور صحیح لغیرہٖ اور حسن کی دو اقسام ہیں: حسن لذاتہٖ اور حسن لغیرہٖ، ''صحیح لغیرہٖ'' جس حدیث کو کہتے ہیں وہ اصلاً حسن لذاتہٖ ہوتی ہے، قرائن کی بنا پر اس کے لیے صحت مان لی جاتی ہے تو صحیح لغیرہ کہہ دیا کرتے ہیں اور '' حسن لغیرہٖ '' جس حدیث کو

(۱) منهج النقد:۲۸۷، تیسیر مصطلح الحدیث :۶۱-۶۲ وغیرہ (۲) منهج النقد و نخبة وغیرہ

کہتے ہیں وہ اصلاً ضعیف ہوتی ہے، قرائن کی بنا پر اس کے لیے حسن کے درجہ کی قوت کا اعتبار کر لیا جاتا ہے اور اسے حجت مانا جاتا ہے، مذکورہ چاروں اقسام کی حجیت معروف اور عام علماءِ امت کے نزدیک مسلم ہے، بجز معدودے چند حضرات کے۔

یہیں سے ہماری اس نشست کا مدعا واضح ہو گیا کہ وہ حدیث جس کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے اور ضعف کی وجہ سے اس کو مردود و غیر مقبول کہا جاتا ہے، اس کا معاملہ ہر حال میں یہ نہیں کہ اس پر عمل نہ کیا جا سکے؛ بلکہ بعض صورتوں میں اس پر عمل کیا جانا متفق علیہ سا ہے، اور ضعیف کا مفہوم ہر حال میں اور مطلقاً یہ نہیں کہ وہ حکماً وعملاً مردود ہی ہو؛ بلکہ وہ اُصولاً غیر مقبول ہوتی ہے اور بعض حالات میں حدود قبول میں داخل ہو جاتی ہے، اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ضعیف کا مطلب موضوع نہیں ہوتا؛ جیسا کہ آج بعض حلقوں میں سمجھا جا رہا ہے؛ بلکہ دونوں میں فرق ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ ضعیف ایک عام اصطلاح اور مقسم ہے، ''موضوع'' اس کی بہت سی اقسام میں سے ایک قسم ہے، دوسری بات یہ کہ کسی حدیث کے حق میں جب تک وضع کا فیصلہ نہ ہو جائے وہ ضعیف عام ہے اور اس کے لیے موضوع کے مخصوص احکام نہیں ہوں گے، یعنی روایت کا عدمِ جواز ثابت نہیں ہوگا، الا یہ کہ کوئی ضرورت داعی ہو تو وضع کی صراحت کے ساتھ روایت کیا جائے اور عمل کا عدمِ جواز، کہ موضوع پر عمل کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ کہ اس کی کسی طرح اور کسی چیز سے تقویت نہیں ہوتی، جب کہ عام ضعیف احادیث میں دوسری روایت کی وجہ سے، نیز بعض اسباب کی بنا پر قوت واعتبار پالینے کی گنجائش ہوتی ہے؛ اس لیے ضعیف کو موضوع کا درجہ دے کر عمل میں سرے سے قابل رد قرار دینا درست نہیں ہے، ہاں یہ بات الگ ہے کہ کسی مسئلہ میں حدیث صحیح موجود ہو تو اس صحیح کے خلاف و بالمقابل کسی حدیثِ ضعیف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ وہ حالات واسباب کیا ہیں جو ضعیف حدیث کو قبولیت کے مرحلے تک اور اس کے چوتھے درجے پر پہنچاتے ہیں؟ نیز یہ کہ کن احادیثِ ضعیفہ پر اور کس حد تک اس قسم کے حالات کے بغیر بھی اعمال کی گنجائش ہے۔

جہاں تک سوال ہے حدیثِ ضعیف کو تقویت پہنچا کر ''حسن لغیرہٖ'' کے مرتبے تک پہنچانے والے اُمور واسباب کا تو اس سلسلے میں دو چیزیں عام ومعروف ہیں، ایک تعددِ طرق، دوسرے تلقی بالقبول۔

تعددِ طرق کا مطلب ہے حدیثِ ضعیف کا ایک سے زائد طریقہ وسند سے مروی ہونا، خواہ کل دو ہی طریق ہوں، ایک اصل واول جو ضعیف ہے، دوسرا مزید، جس سے پہلے کی تقویت ہو اور دوسرا بھی ضعیف ہی ہو(۱) کہ دونوں کو الگ الگ کردیں تو حجت نہ بن سکیں۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دونوں طرق کا منتہی الگ الگ صحابی پر ہو(۲) اور نہ یہ ضروری ہے کہ دونوں میں لفظاً توافق ہو؛ بلکہ معنیً بھی توافق کافی ہے (۳)؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ دوسرا طریق ضعف میں پہلے سے بڑھا ہوا نہ ہو؛ بلکہ اس سے کچھ قوی ہو یا اس کے برابر ہو۔(۴)

البتہ بعض محققین کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دوسرے موافق طرق ایک سے

(۱) سیوطیؒ کہتے ہیں:''ولا بد فی الاحتجاج بحدیث له طریقان ، لو انفرد کل منهما لم یکن حجة کما فی المرسل إذا ورد من وجه آخر مسندا أو وافقه مرسل آخر ''تدریب:۱/۱۶۰، مولانا ظفر احمد فرماتے ہیں:''والحدیث الضعیف إذا تعددت طرقه و لو طریقا واحدة أخری ارتقی بمجموع ذٰلك إلی درجة الحسن ''قواعد فی علوم الحدیث :۴۹؛ البتہ سخاویؒ یہ کہتے ہیں: احکام میں حجت بننے کے لیے مزید طریق یا قرائن درکار ہوں گے، فتح المغیث :۶۸، اور یہی بات ابن القطان المغربی سے منقول ہے، ایضاً والنکت :۴۲۳

(۲) تفصیل وتوضیح کے لیے احقر کا مقالہ ملاحظہ کیا جائے، اس میں مثال بھی آئی ہے۔

(۳) منهج النقد:۲۶۹، مثال وتوضیح کے لیے احقر کا مقالہ ملاحظہ کیا جائے۔

(۴) منهج النقد:۲۶۹، فتح المغیث:۶۳-۷۰، قواعد فی علوم الحدیث:۲۵ وغیرہ

زائد ہوں تو اگرچہ وہ پہلے اور اصل طریق سے کمزور ہوں، تقویت کے لیے کفایت کریں گے؛ اس لیے کہ انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ ''حسن لذاتہٖ'' سے ''صحیح لغیرہٖ'' قرار پانے کے لیے جہاں یہ بات کافی ہے کہ دوسرا طریق اس سے قوی یا اس کے برابر پایا جائے، وہیں یہ بھی کافی ہے کہ ایک سے زائد ضعیف ومنقطع طرق ہوں، کہ اس صورت میں بھی حدیث حسن لذاتہٖ، صحیح لغیرہٖ کہلائے گی۔(۱)

جامع ترمذی میں آپ بکثرت یہ بات پائیں گے کہ امام ترمذیؒ حدیث کو حسن کہتے ہیں اور وجہ تعددِ طرق ہے؛ بلکہ امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں ''حسن'' یعنی صرف ''حسن'' اسی حدیث کو کہا ہے جو اصل کے اعتبار سے ضعیف ہو اور متعدد طرق سے مروی ہو (۲)

ایک حدیث ایک ہی صحابیؓ سے متعدد طرق سے مروی ہو اور طرق کی تعداد زیادہ ہو، جیسا کہ ابھی گذرا کہ اصل طریق کے علاوہ صرف ایک نہ ہو؛ بلکہ چند ہوں تو اس حد تک تعدد محققین کے نزدیک یہ اہمیت رکھتا ہے کہ امام طحاویؒ اس کو تواتر اور ایسی حدیث کو متواتر کہتے ہیں۔(۳)

(۱) مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں: فإن تعددت طرق الحسن لذاته بمجيئه من طريق آخر أقوى أو مساوية أو طرق أخرى ولو منقطعة فهو الصحيح لغيره ، قواعد فی علوم الحديث:۲۴۵،و نحوه فی فتح المغيث :۱۷۱،علامہ شعرانی کی ''الميزان ''میں آیا ہے:و قد احتج جمهور المحدثين بالحديث الضعيف إذا كثرت طرقه والحقوه بالصحيح تارة والحسن أخرى ، قواعد:۵۱؛ بلکہ متعدد حضرات سے ایسا ہی منقول ہے،مثلاً سبکیؒ و ابن الہمامؒ،قواعد:۲۵-۵۱،مع حاشيه

(۲) امام ترمذیؒ کی یہ اصطلاح معروف ہے اور یہ بات بھی کہ علماء نے اس بابت کافی کلام کیا ہے؛ لیکن مذکورہ توجیہ کہ یہ ایک اصطلاح خاص ہے اور خاص صورت کے لیے ہے،''ترمذی''میں بھی لفظِ ''حسن'' جہاں آیا ہے، ہر موقع کے لیے نہیں ہے، دکتور نور الدین نے اس کی کافی وضاحت کی ہے، منهج النقد :۲۶۷-۲۷۰، ہمارے اکابر کا رجحان بھی یہی ہے، مثلاً مولانا ظفر احمد،قواعد:۲۶ و علامہ کشمیریؒ وغیرہ، معارف السنن:۸۶/۱، ظفر الأماني:۱۹۶

(۳) تفصیل و مثال کے لیے احقر کا مقالہ دیکھئے: نیز شرح معانی الآثار ، باب الرجل يوجه الهدی إلى مكة الخ ، وباب اللباس والطيب متى يحلان للمحرم ، وباب وقت رمی جمرة العقبة للضعفاء

''تلقی بالقبول'': کوئی حدیث ضعیف جب متلقی بالقبول ہو تو اس کی حیثیت بدل جاتی ہے اور تلقی بالقبول کا مطلب ہے کہ علماءِ امت کی طرف سے اس کو قبولیت حاصل ہو اور ان میں وہ مقبول و معروف اور معتمد ہو، اس تلقی کی وجہ سے حدیثِ ضعیف میں قوت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ قوت تعددِ طرق کی وجہ سے حاصل ہونے والی قوت سے مختلف اور اس سے کہیں فائق ہوتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ تعددِ طرق میں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک کمزور روایت کو مزید ایک یا دو چار آدمی روایت کرتے ہیں۔

اور ''تلقی بالقبول''(۱) فی الجملہ قبولِ عام کے مفہوم میں ہے، جس کو کبھی اجماع کی حیثیت وصورت بھی حاصل ہو جاتی ہے ورنہ شہرت؛ بلکہ تواتر کی صورت تو ہوتی ہی ہے اور معلوم ہے کہ اجماع و تواتر کے لیے قطعیت کا درجہ مانا جاتا ہے، جیسا کہ مشہور کی قوت بھی عام اخبارِ آحاد سے فائق ہے، یعنی مشہور عند المحدثین؛ کیوں کہ مشہور عند الاصولیین تو اس سے بھی فائق ہے، محدثین کی اصطلاح پر مشہور اخبارِ آحاد کی ایک قسم ہے اور اُصولیین (حنفیہ) کی اصطلاح میں مشہور خبرِ واحد کی قسم ہے۔(۲)

"تلقی بالقبول" کے لیے خاص انداز کی جس قوت کا تذکرہ کیا گیا، اس کا اندازہ تلقی کی صورت کو صحیح طور پر جاننے اور سمجھنے سے ہی ہوسکتا ہے، کہ تلقی کا مفہوم فی الجملہ قبولِ عام ہے اور اس قبولِ عام کی دو شکلیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ عموماً علماء کا عمل اس کے موافق ہو اور دوسرے یہ کہ کثرت سے لوگ یعنی علماء اس کو روایت کرتے اور ذکر کرتے ہوں، یہ دونوں ہی صورتیں تلقی کی ہوتی ہیں (۳) اور دونوں ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

جامع ترمذی میں آپ "وعلیه العمل عند أهل العلم" یا "وعلیه أکثر أهل العلم" (۱) جو پڑھتے ہیں تو اس سے تلقی بالقبول، بصورتِ عمل ہی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔

اور امام مالکؒ کا ارشاد جو دارقطنی (۲) میں آیا ہے اور آپ نے سنا اور پڑھا بھی ہے "شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سنده" اس سے تلقی بالقبول بصورتِ روایت مراد ہے۔

اسی تلقی بالقبول عملاً کی بنیاد پر امام شافعیؒ نے پانی کی نجاست وطہارت سے متعلق اس حدیث کو یا حدیث کے ٹکڑے کو صحیح ومعتبر قرار دیا ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ جب نجاست کی وجہ سے پانی کا مزہ یا رنگ یا بو بدل جائے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ (۳)

اسی طرح حدیث "لا وصية لوارث" کے متعلق بھی فرمایا ہے: "لا يثبته أهل العلم بالحديث : ولكن العامة تلقته بالقبول وعملوا به حتى جعلوه ناسخا لآية الوصية للوارث"۔ (۴)

اور تلقی بالقبول روایۃً نقلاً وقولاً کی طرف ابن عبدالبر نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے، وہ: (تركت فيكم أمرين الحديث سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے) فرماتے ہیں: هذا حديث محفوظ مشهور عن النبي صلى الله عليه وسلم عند أهل العلم شهرة يكاد يستغني بها عن الاسناد (۵) اور اسی کو مراد لیا ہے ابن القیمؒ نے (اجتہاد) سے متعلق حضرت معاذؓ کی مشہور حدیث کی بابت یہ فرماتے ہوئے:

(۱) تلقی بالقبول کی بابت تفصیل کے لیے الأجوبة الفاضلة ، تعليقات کا تتمه از: ۲۲۸ ملاحظہ کیا جائے۔

(۲) تفصیل کے لیے "الموجز في أصول الفقه" اور "علوم الحديث" وغیرہ دیکھئے۔

(۳) قواعد فی علوم الحدیث: ۴۰

(۱) باب ماجاء في من استقاء عمدا ، باب ما جاء في الصلاة على الدابة في الطين والمطر ، و باب ما جاء في الرجل يقتل ابنه (۲) دارقطنی: ۲/۲۴۱، قال الأسفرائيني : تعرف صحة الحديث إذا اشتهر عند أئمة الحديث بغير نكير منهم

(۳) كتاب الأم: ۱/۳، اس حدیث کو امام طحاویؒ ودارقطنیؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے، مرفوع کو انتہائی ضعیف بتایا گیا ہے؛ البتہ ابوحاتم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، إعلاء السنن: ۱/۱۷۹، أماني الأحبار: ۱/۴۶، تلخيص الحبير: ۱/۴

(۴) النكت مع التعليق: ۹۵-۴۹۴ (۵) تجريد التمهيد: ۲۵۱

وإن كانت هذه الأحاديث لم تثبت من جهة الإسناد ...... لكن لما نقلها الكافة عن الكافة غنوا بصحتها عندهم عن طلب الإسناد لها . (۱)

اس حدیث کی قوت کی نسبت سے جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ قطعیت تک اور تواتر ومشہور اُصول سے افادہ کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے، تو یہ بات امام شافعیؒ کے مذکورہ ارشاد سے واضح ہے کہ انہوں نے ''لا وصیۃ لـوارث'' (۲) حدیث کو ضعف وعدمِ ثبوت کے باوجود ناسخ بتایا ہے اور وہ بھی آیت کے لیے، تو قرآن کریم کا ناسخ تو اسی درجہ میں قوی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے، جس درجہ میں آیت کی قوت ہوتی ہے یعنی قطعیت کے ساتھ ثبوت۔

متواتر کا درجہ اختیار کرنے کی بات ابوبکر جصاص رازیؒ (۳) اور سخاویؒ (۴) وغیرہ نے بھی ذکر کی ہے، جیسے کہ قطعیت کی صراحت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وابن القیم وغیرہ سے بھی منقول ہے اور ان کے واسطے سے دوسرے سلف وخلف سے بھی۔ (۵)

اب تلقی بالقبول کی صورت کی نسبت سے چند باتیں اور عرض کردوں۔

ایک تو یہ کہ تلقی کی دو شکلیں ذکر کی گئی ہیں، دونوں ہی شکلیں افادہ میں اہم ہیں؛ لیکن حکماً دونوں کے مرتبے میں فرق کیا گیا ہے جیسا کہ ابن حجرؒ اور ان کے پیشرو، ابن فورک وغیرہ کے بیان سے ظاہر وواضح ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ اگر تلقی صرف عملاً ہو تو صحیح خبر واحد کا درجہ ہوگا، جو صرف وجوبِ عمل کا فائدہ دیتی ہے اور تلقی قولاً وفعل دونوں طرح ہو، یعنی روایۃً بھی اور عملاً بھی، تو خبر متواتر کا درجہ ہوگا (۶) اگرچہ عموماً اس قسم کی تفصیل منقول نہیں ؛ لیکن یہ

(۱) إعلام الموقعين: ۲۰۳/۱، تحفة الأحوذي: ۵۵۹/۴

(۲) اس حدیث کے متعلق معروف یہی ہے کہ یہ انتہائی ضعیف ہے؛ لیکن علامہ کوثریؒ نے اس کے ثبوت وصحت پر مستقل ایک بحث لکھی ہے؛ جیسا کہ شیخ عبدالفتاح نے ذکر فرمایا ہے، تعليقات الأجوبة: ۵۲

(۳) أحكام القرآن: ۳۸۶/۱

(۴) فتح المغيث: ۲۸۰، الأجوبة: ۵۱-۵۲

(۵) النكت على ابن الصلاح: ۳۷۴

(۶) النكت: ۳۷۳

فرق ایسا ہی ہوگا جیسے کہ اجماع کی صورت میں کیا جاتا ہے، (۱) (اجماع صریح اور اجماع سکوتی اور اجماع متواتر واجماع مشہور وغیرہ میں)۔

دوسری بات یہ کہ حدیث ضعیف کو تقویت تعددِ طرق اور تلقی دونوں سے ہوتی ہے؛ لیکن تعددِ طرق کی وجہ سے وہ ''حسن لغیرہٖ'' کے درجہ تک اور کبھی ''صحیح لغیرہٖ'' کے مرتبے کو بھی پہنچ جاتی ہے، جس کا مرتبہ ''صحیح لذاتہٖ'' سے، بہرحال کمتر ہے اور ''صحیح لذاتہٖ'' صرف وجوبِ عمل کا فائدہ دیتی ہے اور تلقی کی وجہ سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ اس سے بڑھ کر ہوتی ہے، بالخصوص جب تلقی قولاً وعملاً دونوں طرح ہو، حتی کہ اس کی وجہ سے قطعیت کے درجہ تک حدیث ضعیف پہنچ جاتی ہے۔ (۲)

تیسری بات یہ کہ جس حدیث کو ''حسن لذاتہٖ'' قرار دیا جائے، اس پر عمل کے حق میں کچھ حضرات کا اختلاف ہے تو حسن لغیرہٖ کا درجہ تو اور بھی کمزور ہے، اس لیے اس کی بابت اختلاف ناگزیر ہے، ایک جماعت نے اس کی اصل کو دیکھتے ہوئے عمل کو منع کیا ہے (۳) گویا مجموعہ واجتماعیت کی ان کے یہاں کوئی وقعت نہیں یعنی تعددِ طرق کی بنا پر حاصل ہونے والی قوت کے اعتبار میں اختلاف ہے؛ لیکن جس حدیث ضعیف کو تلقی کی وجہ سے تقویت ہو رہی ہو، اس کی بابت کم ازکم معروف علماء وائمہ مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ کی صراحتوں سے پتہ چلتا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے ''النکت'' میں ایک موقع سے ابن تیمیہؒ سے نقل کیا ہے :

الخبر إذا تلقته الأئمة بالقبول تصديقا له وعملاً بموجبه أفاد العلم عند جماهير العلماء من السلف والخلف

(۱) ملاحظہ ہو: الموجز في أصول الفقه: ۲۰۲-۲۱۹، ۲۲۴، فواتح الرحموت: ۲۴۲/۲-۲۴۶

(۲) تدريب الراوي: ۱۵۴/۱، ابوحاتم رازیؒ سے کچھ اسی انداز کی بات منقول ہے۔

(۳) النكت: ۴۰۲-۴۰۳، ابن القطان مغربی سے منقول ہے کہ ایسی حدیث پر فضائل اعمال میں عمل کیا جائے گا

اور احکام میں اسی وقت جب کہ طرق زیادہ ہوں یا موافقت وتائید میں عمل یا کوئی شاہد یا قرائن موجود ہوں۔

وهو الذى ذكره جمهور الأصوليين فى أصول الفقه ...... وهو مذهب أهل الحديث قاطبه .

چوتھی بات یہ کہ تعددِ طرق کی وجہ سے تقویت کے سلسلے میں یہ بات معروف ہے کہ حدیث شدید الضعف نہ ہو، موضوع نہ ہو یا یہ کہ اس کا مجروح راوی متہم بالکذب ومتروک وغیرہ نہ ہو، ایک اُصولی سی بات یہ کہ اس کا ضبط متاثر ہو، عدالت متاثر نہ ہو؛ لیکن تلقی کی صورت میں وضع کا مسئلہ تو خیر حد سے باہر ہی رہے گا، البتہ ضعفِ شدید کی بقیہ صورتیں اس کے تحت آسکتی ہیں، وہ صورتیں جن میں تعدد سے حسن وقوت کا فائدہ نہیں ہوتا، یہ احقر کا احساس وخیال ہے، جو ایک جائزہ پر مبنی ہے؛ البتہ صراحت نہیں مل سکی۔

تعددِ طرق یا تلقی کی وجہ سے حدیثِ ضعیف کی تقویت میں اس کا فرق نہیں کہ حدیث کا ضعف دو بنیادی امور میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہی ہو، یعنی مثلاً راوی کی عدالت یا ضبط میں کمی وخلل کی وجہ سے ہو تو یہ تقویت ہوگی ورنہ نہیں، بلکہ ضعف کا سبب خواہ راوی کے اندر کسی طرح کی کمی ہو یا سند میں انقطاع جیسے مرسل وغیرہ، ہر صورت میں تعدد یا تلقی سے قوت حاصل ہوتی ہے(۱) آپ جامع ترمذی کی روایات کا جائزہ لیجئے تو آپ کو تعددِ طرق وتلقی دونوں کے لیے دونوں طرح کی مثالیں مل جائیں گی۔

مثلاً عبداللہ بن مسعود کے صاحبزادے ابوعبیدہ نے اپنے والد ابن مسعود سے جو روایات نقل کی ہیں، ان کو امام ترمذیؒ نے حسن قرار دیا ہے، حالانکہ جمہور والد سے ان کا سماع ثابت نہیں مانتے اور خود ترمذیؒ نے بھی انکار کیا ہے (۲) اسی طرح بعض دوسرے مواقع میں انقطاع کی صراحت کے ساتھ یا اس کے بغیر ؛ حالانکہ واقعتاً انقطاع پایا جاتا ہے پھر بھی

(۱) منهج النقد:۲۶۹ (۲) ملاحظہ ہو:كتاب الجهاد ، باب ماجاء فى المشورة ، أبواب الطهارة ، باب فى الإستنجاء بالحجرين ، أبواب الصلاة مقدار القعود ، باب ماجاء فى الرجل تفوته الصلوات باية يبدأ ، نیز ملاحظہ ہو:النكت :۳۹۸، الترمذى

حدیث کو انھوں نے صحیح یا حسن کہا ہے اور یہ تحسین وتصحیح صرف شواہد وتعددِ طرق کی وجہ سے ہے۔(۱)

اسی طرح دیگر بعض اسباب کی وجہ سے ضعف کے پائے جانے کے باوجود شواہد کی وجہ سے تحسین وتصحیح کی مثالیں بھی ملتی ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے ''النكت'' میں کئی مثالیں ذکر فرمائی ہیں جب کہ کسی حدیث کا راوی سیئ الحفظ، کسی کا کثیر الغلط اور کسی کا مختلط یا مدلس ہے۔(۲)

جیسے کہ تلقی کی بنا پر تقویت کی مثالیں بھی مل جائیں گی، خواہ ضعف راویوں کی صفات کا ہو یا ضعف کا سبب انقطاع ہو۔(۳)

بات پھیلتی جارہی ہے اور ابھی آج کے موضوع کے تحت ایک اہم پہلو کا ذکر باقی ہے، اس سے پہلے دو باتیں اور عرض کردوں کہ تعددِ طرق کی وجہ سے تقویت ہر ضعیف کے لیے نہیں ہے جب کہ ضعیف کا مصداق بہت وسیع ہے، مختصراً یہ کہ وہی روایت اس سے فائدہ اٹھاتی ہے جو شدید الضعف نہ ہو، مثلاً یہ کہ معلق و مرسل وغیرہ ہو یا مدلس ومستور اور سیئ الحفظ ومختلط کی روایت ہو(۴) اور شدید الضعف جس کو فائدہ نہیں ہوتا، اس میں موضوع روایت داخل ہے، نیز فاسق اور متہم بالکذب کی روایت ، بالخصوص جب کہ موافق روایت بھی اسی طرح

(۱) باب ماجاء فى أبواب المناقب ، باب مناقب العباس و أبواب الصلاة باب ماجاء فى الوقت الأول من الفضل ، نیز ملاحظہ ہو:النكت على ابن الصلاح:۳۹۶-۳۹۷،الترمذى أبواب الصلاة ، باب مايقول عند دخول المسجد (۲) ملاحظہ ہو:النكت:۳۸۸-۳۹۵،جامع ترمذى ، أبواب النكاح ، باب الصداق ، أبواب البيوع ، باب ماجاء فى نهى المسلم أن يدفع الخمر الخ ، أبواب الجنائز ، باب ماجاء أن المؤمن يموت بعرق جبينه

(۳) مثلاً ابوعبیدہ کی روایت: ”باب ماجاء فی مقدار القعود بین الرکعتین ، أبواب الصلوۃ “ میں ابوعبیدہ کے ابن مسعودؓ سے سماع کی نفی بھی کی ہے اور حدیث کو حسن بھی کہا ہے اور یہ بھی کہ علیہ العمل الخ اور باب میں ضعیف حدیث کی صراحت کے ساتھ اکثر اہل علم کا عمل ذکر کیا ہے۔

(۴) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: احقر کا مقالہ نیز: نزھۃ النظر :۵۱-۵۳، مقدمہ ابن الصلاح :۱۷، قواعد فی علوم الحدیث :۷۶

کی ہو(۱)؛ البتہ اسی کے ساتھ محققین نے اس کی صراحت کی ہے کہ موضوع کو چھوڑ کر بقیہ روایات جن کو تعدد سے قوت وحسن کا فائدہ نہیں ہوتا، ان کو بالخصوص جب کہ کئی طرق جمع ہو جائیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان کے حق میں ”منکر“ اور ”لا أصل لہ“ کہنا درست نہیں رہ جاتا اور بقولِ بعض یہ حیثیت ہو جاتی ہے کہ وہ اب ضعیف محض نہیں رہ گئی فضائل میں عمل ہو سکتا ہے اور مزید طرق کی تحقیق ہو جائے تو مرتبہ میں مزید قوت آجاتی ہے اور پھر حسن لغیرہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔(۲)

دوسری بات یہ کہ تعدد وتلقی کے ذریعہ تقویت تو معروف ہے؛ لیکن اس کے علاوہ بھی بعض امور حدیثِ ضعیف کی قوت کا باعث ہوتے ہیں، جن کو بسا اوقات قرائن کے عنوان ولفظ سے ذکر کیا گیا ہے اور تفصیل میں قرآن کریم کی موافقت، کسی قاعدۂ شریعت کی موافقت اور قولِ صحابی وفعل صحابی سے تائید کو ذکر کیا جاتا ہے؛ بلکہ اس قسم کے قرائن ومؤیدات کی صورت میں ایسی حدیث ضعیف پر عمل کے سلسلے میں جو اختلاف ہے —— جس کا تذکرہ آچکا ہے —— وہ ختم ہو جاتا ہے یا یہ کہ اختلاف کرنے والوں کا ایک طبقہ اختلاف نہیں کرتا۔(۳)

حدیثِ ضعیف پر عمل سے متعلق دوسرا پہلو قابل ذکر یہ ہے کہ جب اس کے لیے کوئی مؤید نہ ہو تو اس صورت میں اس پر عمل کا حکم کیا ہے؟ معروف امر تو یہ ہے کہ اس پر عمل جائز نہیں؛ لیکن مصطلح الحدیث کی کتابوں اور دیگر مواقع میں اس بابت جو گفتگو آئی ہے اس کے مطابق دو صورتیں یا مواقع اس پر عمل کے ذکر کیے جاتے ہیں: اگرچہ وہ اتفاقی نہ ہوں مگر جیسے یہ معروف ہے کہ ضعیف پر عمل نہیں کیا جاتا، یہ بھی معروف ہے۔

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: احقر کا مقالہ نیز تدریب الراوی :۱/۱۷۷، مقدمہ ابن الصلاح :۱۷

(۲) تدریب الراوی :۱/۱۷۷، النکت :۴۲۰، فتح المغیث :۷۰، اس میں مثالیں بھی ہیں۔

(۳) نزھتہ النظر :۲۹، فتح المغیث :۶۴-۶۸-۶۹، فتح القدیر :۱/۸۷، قواعد فی علوم حدیث:

ایک موقع تو فضائل اعمال کا ہے کہ وہ ضعیف حدیثیں جن میں کسی عمل کی فضیلت اور خاص اجر وثواب کا تذکرہ ہے، ان پر اس فضل وثواب کے حصول کے جذبے کے تحت عمل کیا جا سکتا ہے، اس بابت یوں تو بہت سے حضرات نے کچھ نہ کچھ تذکرہ کیا ہے، مگر مولانا عبدالحیؒ صاحب لکھنوی نے ”الأجوبۃ الفاضلۃ “ کے پہلے سوال وجواب کے تحت اس بابت تفصیل سے کلام کیا ہے اور عبارتیں نقل کی ہیں اور ایک طرح اس بابت تصریحات کا احاطہ کر لیا ہے۔

اس سلسلے میں کچھ اختلاف بھی ہے، جو یحیٰی بن معینؒ وغیرہ سے منقول ہے(۱)؛ لیکن ان کے علاوہ متقدمین ومتاخرین، اساطین وافاضل سب ہی اس وسعت پر متفق ہیں، ان میں امام احمد، عبدالرحمٰن بن مہدی، علی بن المدینی، عزالدین ابن عبدالسلام، ابن الصلاح اور ابن عبد نووی، ابن حجر رحمہم اللہ وغیرہ سب ہی حضرات کا نام آتا ہے اور سب کی صراحتیں موجود ہیں۔(۲)

البتہ یہ رخصت ووسعت مطلقاً نہیں ہے؛ بلکہ اس کے لیے تین شرطیں معروف ہیں :

دوم: یہ کہ کسی نہ کسی اصل شرعی اور عمل شرعی کے تحت داخل ہو، یعنی کسی عام مفہوم آیت یا روایت یا قاعدۂ شریعت کے تحت آتی ہو۔

سوم: یہ کہ عمل اس کے ثبوت کے اعتقاد کے ساتھ نہ ہو یعنی یہ کہ اس کو قطعیت یا غلبۂ ظن کے ساتھ ثابت نہ مانا جائے کہ ایسا کرنے پر مشہور وعید صادق آئے گی۔(۳)

(۱) الأجوبة الفاضلة:۳۷

(۲) الأجوبة الفاضلة:۳۶-۵۲،مع التعليقات وظفر الامانى:۲۰۹-۲۱۴

(۳) الأجوبة:۴۳-۴۴،تدريب الراوى:۲۹۸/۱-۲۹۹-۱۹۶

مولانا عبدالحئیؒ صاحب نے کئی مثالیں ذکر فرمائی ہیں (۱) جن کو شیخ عبدالفتاح نے بھی نقل کیا ہے (۲) ان کا جائزہ لینے پر جو مثال موقع سے زیادہ مناسب معلوم ہوئی وہ گردن کے مسح کی فضیلت سے متعلق وارد ہونے والی حدیث ہے، ''مسح الرقبة أمان الغل يوم القيامة'' اس کو عراقی اور زبیدی وغیرہ نے ضعیف کہا ہے (۳)؛ لیکن فضائل کے باب سے تعلق کی وجہ سے اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔

دوسرا موقع نفس احکام، جواز وعدمِ جواز اور ثبوت ونفی یا استحباب وغیرہ کے حق میں حدیثِ ضعیف پر عمل واعتماد کا ہے، اس کا معاملہ یہ ہے کہ جس وسعت و اہتمام کے ساتھ آپ فضائل میں حدیثِ ضعیف پر عمل کے جواز وگنجائش کی بات پڑھیں گے، اسی درجہ میں اور انہیں عبارتوں ومواقع میں آپ عموماً اس کی نفی بھی پڑھیں گے کہ احکام کے باب میں ضعیف پر عمل کی اجازت نہیں (۴) اور ائمہ کا یہ ارشاد کہ فضائل وغیرہ، نیز سیر ومغازی میں تو ہم تساہل ووسعت برتتے ہیں؛ لیکن حلال وحرام میں ہم شدت برتتے ہیں (۵)؛ لیکن اسی کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ کے لیے خصوصیت سے یہ بات معروف ہے اور تحقیق سے امام مالکؒ وامام شافعیؒ سے بھی ثابت ہے کہ ان حضرات نے متعدد مسائل میں حدیثِ ضعیف پر اعتماد کیا ہے اور یہ بات ان حضرات سے عملاً تو مروی ہے ہی قولاً بھی مروی ہے کہ امام احمدؒ کا قول تو بہت معروف ہے: ''ضعيف الحديث عندنا أحب من رأى الرجال''

(۱) ظفر الأمانى:۲۱۰-۲۱۳ (۲) الأجوبة الفاضلة تعليقات:۴۴-۴۶

(۳) تخريج أحياء:۴۶/۲،اتحاف السادة المتقين:۳۶۵/۲،إعلاء السنن:۶۸/۱-۶۹

(۴) ملاحظہ ہو:الأجوبة الفاضلة وغیرہ،مراجع سابقہ،جن کا تذکرہ فضائل کے تحت کیا گیا ہے،امام نوویؒ تقریب میں فرماتے ہیں: ''يجوز عند أهل الحديث التساهل فى الأسانيد الضعيفة ...... والعمل بها من غير بيان ضعفه فى غير صفات الله و الأحكام ، تقريب وتدريب:۲۹۸/۱

(۵) الكفاية:۱۳۴،الأجوبة:۳۶،تدريب الراوى:۲۹۸/۱

اور حنفیہ کے قول کو ابن القیم وابن حزمؒ وذہبیؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔(۱)

ابن القیمؒ نے مذاہبِ اربعہ میں حدیثِ ضعیف پر عمل کا دعویٰ کیا ہے اور مثالیں بھی ذکر کی ہیں (۲) اور مسائل کا جائزہ لینے سے ابن القیم کے اس دعوی کی تائید ہوتی ہے۔

البتہ ایک بات یہ کہ امام احمدؒ یا حنفیہ کا یہ قول جن حضرات نے نقل کیا ہے، انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے اور متعدد حضرات نے اس کو ثابت کرنے کی سعی کی ہے، کہ ان حضرات کے ارشادات میں ضعیف سے وہ ضعیف مراد ہے جو حسن لغیرہ کے مرتبے کو پہنچ جائے ضعیف محض نہیں اور اس طرح انہوں نے ان حضرات کو جمہور کا موافق بتایا ہے اور بنایا ہے، اس بابت عمومی رجحان کچھ اسی قسم کا ہے اور اس کی وجہ انکار کا معروف ہونا ہے۔

اس مسئلہ میں مولانا عبدالحئیؒ صاحب لکھنویؒ نے ظفر الامانی میں مفصل بحث فرمائی ہے اور اس میں اس مدعا (احکام میں حدیثِ ضعیف پر عمل) کو یوں ثابت کیا ہے کہ فضائل میں حدیثِ ضعیف کے اعتبار کی بات اس وقت ہوگی جب کہ نفس عمل کا ثبوت وجواز کسی دوسری معتبر روایت سے ہو، خواہ وہ کسی درجہ کی ہو، پھر اس کے بعد اس کی فضیلت اور خصوصی ثواب واجر کے حق میں ضعیف کو دیکھا جائے جیسے پیچھے گردن کے مسح کا تذکرہ آیا ہے تو اس بابت کچھ روایات وہ ہیں جن میں صرف اس فعل کا تذکرہ ہے (۳) اور مسندِ فردوس کی ایک روایت میں اس کے فضل وخصوصی ثواب کا تذکرہ ہے۔

اور اگر نفس استحباب و کراہت کے لیے حدیثِ ضعیف کا تذکرہ کیا جائے اور سہارا لیا جائے تو یہ تو احکام ہی کے لیے استدلال ہوا، استحباب و کراہت خود احکام

ہیں اور ان اُمور کے

(۱) ملاحظہ ہو: الأجوبة الفاضلہ مع التعلیقات: ۴۶-۵۲، احقر کا مقالہ، نیز القول البدیع: ۹۵، فتح المغیث، ظفر الأمانی و قواعد فی علوم الحدیث وغیرہ میں بھی کافی تفصیل آئی ہے، ظفر الأمانی: ۱۴-۲۳

(۲) إعلام الموقعین: ۱/۳۱-۳۲

(۳) ملاحظہ ہو: مسندِ أحمد: ۳/۴۸۱، أبوداؤد، کتاب الطهارة باب صفة وضوء النبی ﷺ

اثبات کے لیے ضعیف سے استدلال کی صراحت ابن ہمامؒ اور نوویؒ وغیرہ نے کی ہے۔(۱)

دوسری بات یہ ہے کہ یہ توجیہ کہ ضعیف سے متاخرین کے یہاں جس کو ضعیف کہتے ہیں وہ مراد نہیں؛ بلکہ حسن لغیرہ مراد ہے، اس بابت جو اقوال و تفصیلات محفوظ ہیں، ان کا جائزہ اس کی تردید کرتا ہے۔

حنفیہ میں ابن الہمامؒ صاف فرماتے ہیں: ''الإستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع''۔(۲)

حنابلہ میں ابن القیم امام احمدؒ کے اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والأصل الرابع: الأخذ بالمرسل و الحدیث الضعیف إذا لم یکن فی الباب شئ یدفعه و هو الذی رجحه علی القیاس. (۳)

ماوردی سے نقل کیا گیا ہے کہ امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ: ''إن المرسل یحتج به إذا لم یوجد دلالة سواه''۔(۴)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

قد جاء ت الآثار فی ذلک متواترة و إن کان أکثرها منقطعا فإنه منقطع لم یضاده متصل. (۵)

مالکیہ کے لیے ابن القیمؒ فرماتے ہیں:

وأما مالک فإنه یقدم الحدیث المرسل والمنقطع

(۱) فتح القدیر: ۲/۹۰، الاذکار للنووی: ۵-۶، فتح المغیث: ۳۸۵

(۲) فتح القدیر: ۲/۹۵

(۳) إعلام الموقعین: ۱/۳۱

(۴) فتح الملهم: ۱/۲۹، فتح المغیث: ۸-۲۸۵

(۵) معانی الآثار، کتاب البیوع، باب خیار الرؤیة

والبلاغات. (۱)

اسی لیے مولانا عبدالحیؒ صاحب نے ساری بحث اور ردّ و کد کے بعد فرمایا ہے:

الحق فی هذا المقام أنه إذا لم یثبت ندب شئ أو جوازه بخصوصه بحدیث صحیح و ورد بذلک حدیث ضعیف — لیس شدید الضعف — ثبت استحبابه و جوازه به. (۲)

اور یہ بھی فرماتے ہیں :

خلاصة الكلام الدافع للأوهام هو أن ثبوت الإستحباب أو الكراهة التي هي في قوة الإستحباب أوالجواز بالحديث الضعيف مع الشروط المتقدمة لاينافي قولهم : " إنه لايثبت به الأحكام الشرعية " . (۳)

مولانا عبدالحئ صاحب کا جو موقف ہے، یہی علامہ شبیر احمد عثمانی (۴) اور معاصر شامی عالم و محقق محمد عوامہ کا بھی ہے (۵) محمد عوامہ کی پوری بحث کو " قواعد فی علوم الحدیث " کے حاشیہ میں نقل کیا گیا ہے، ماضی کے حضرات میں سخاویؒ سے بھی کچھ ایسا ہی منقول ہے۔ (۶)

شیخ عوامہ کی تحقیق و تفصیل کے مطابق حدیثِ ضعیف کے چند مرحلے کیے جائیں: پہلا حدیثِ ضعیف جو تقویت کی وجہ سے حسن لغیرہ قرار پاتی ہے، دوسرا متوسط الضعیف، تیسرا شدید الضعف ، امام صاحبؒ و امام احمدؒ نے دوسرے متوسط یعنی متوسط الضعف کو مراد لیا ہے نہ کہ تیسرے کو اور نہ پہلے کو۔ (۷)

(۱) إعلام الموقعين :۳۲/۱ (۲) الأجوبة الفاضلة:۵۵

(۳) ظفر الأماني:۲۲۲ (۴) فتح المهم:۲۹/۱

(۵) قواعد في علوم الحديث:۶۶/۲۲ (۶) فتح المغيث:۸۱

(۷) قواعد في علوم الحديث:۶۲

بہر حال راجح یہی ہے کہ مذکورہ ائمہ نے ضعیف سے ضعیف، متوسط الضعف سے غیر شدید الضعف کو ہی مراد لیا ہے کہ مجتہد کو اس وقت تک قیاس کی اجازت نہیں یا ہم اس وقت تک قیاس نہیں کرتے جب تک صورتِ حال یہ نہ ہو کہ اس قسم کی حدیثِ ضعیف بھی نہ ملتی ہو۔

اور جیسے فضائل میں اس قسم کی حدیث کا اعتبار، اس کی رعایت اور اس پر عمل کے جواز کے لیے تین شرطیں ہیں، محققین نے صراحت کی ہے اور مولانا عبد الحئ صاحبؒ نے خصوصیت سے وضاحت کی ہے کہ یہاں بھی ان تینوں شرطوں کی رعایت کے ساتھ اور ان کے بعد ہی اعتبار و عمل کا جواز ہوگا، اس کے بغیر نہ ہوگا، مولانا عبدالحئ صاحبؒ کی آخری عبارت میں اس کا ذکر موجود ہے اور انہوں نے اس کو وضاحت کے ساتھ بار بار ذکر فرمایا ہے نیز تین شرطوں کے ساتھ چوتھی شرط یہ ذکر کی ہے کہ مسئلہ میں کوئی دوسری قوی دلیل موجود نہ ہو (۱) جیسا کہ دوسرے بعض حضرات نے بھی اس بات کا تذکرہ کیا ہے (۲) اور یہ اس لیے کہ دلائل کا درجہ بدرجہ سہارا لیا جاتا ہے، حدیثِ ضعیف منصوصات میں آخری درجہ کی چیز ہے۔

ابن القیم اور شیخ عبدالفتاح وغیرہ نے اس بابت مثالیں بھی ذکر فرمائی ہیں؛ لیکن وہ مثالیں اس تحقیق پر منطبق نہیں کہ ضعیف سے ضعیف متوسط مراد ہے نہ کہ حسن لغیرہ؛ بلکہ مثالیں تو دوسرے قول کے مطابق ہی ہیں جسے مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے بھی اختیار کیا ہے کہ ضعیف سے مراد حسن لغیرہ ہے، اسی لیے انہوں فرمایا ہے کہ ابن قیمؒ کی ذکر کردہ مثالوں کا جائزہ لو تو وہ ساری حدیثیں جو انہوں نے حنفیہ کے حق میں ذکر کی ہیں وہ یا تو حسن لذاتہٖ ہیں

(۱) ظفر الأماني:۲۲۲،الأجوبة الفاضلة:۵۵،ظفر الأماني:۲۲۱

(۲) إعلاء السنن :۱۵۰/۱۴،شرح معاني الآثار ، كتاب البيوع ، إعلام الموقعين :۳۱/۱، تدريب الراوي:۲۰۲/۱

یا حسن لغیرہ۔ (۱)

مثلاً اذان میں ترسل (ٹھہراؤ) کی حدیث کو ضعیف بتایا گیا ہے، مگر " معارف السنن " میں اس کے تعدد کی طرف اور پھر اس کے مطابق تعامل کی وجہ سے اس کو قوی بتایا گیا ہے۔ (۲)

البتہ اپنے ناقص تتبع و جستجو کے بعد ایک مثال احقر کو بظاہر اس قبیل کی مل سکی، وہ ہے دھوپ میں گرم ہونے والے پانی کے استعمال کی کراہت و ممانعت والی حدیث (۳) جائزہ لینے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ اتنی شدید الضعف ہے کہ تعددِ طرق کی وجہ سے بھی اس کو قوت حاصل نہیں ہوسکتی، ہر سند و طریق میں کذاب، متہم بالکذب یا متروک جیسے راوی ہیں؛ البتہ ایک موقوف روایت جس کی بعض ائمہ نے تقویت کی ہے، اسی کی وجہ سے اس مرفوع کو اس درجہ میں مانا جاسکتا ہے کہ

اس کو منکر و بے اصل نہ کہا جائے اور مزید قرائن مل جائیں تو حسن لغیرہ قرار دیں، ورنہ اس درجہ کی ہو جاتی ہے کہ جس درجہ کی روایت کو فضائل میں بہت سے حضرات قبول کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مسائل میں جو لوگ ضعیف کو قبول کرتے ہیں وہ کم از کم فضائل کے لیے مطلوب ضعیف کے درجے و مرتبے میں ہونی چاہیے۔(۴)



(۱) قواعد فی علوم الحدیث:٦٧ نیز ملاحظہ ہو:احقر کا مقالہ

(۲) معارف السنن:۲/۱۹۷

(۳) حدیث کے لیے نصب الرایۃ:۱/۱۰۱-۱۰۳،تلخیص الحبیر:۱/۳۲-۳۳

(۴) سابقہ مراجع (مذکورہ حاشیہ) کے علاوہ ملاحظہ ہو:إعلاء السنن :۱/۱۹۳-۱۹۴

اصطلاحاتِ حدیث

تاریخ — اہم کتب اور شخصیات

علماءِ حدیث نے حدیث کی کتابت وتدوین سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ذکر فرمایا ہے کہ طالب حدیث کو چاہیے کہ وہ حدیث کے ضبط وتحریر کا اور حدیث سے متعلق تصنیف وتالیف کے کام کا اہتمام کرے اور جس چیز کی ضرورت کا احساس ہو اس پر حسبِ توفیق لکھنے کی سعی کرے۔ (۱)

یوں تو ہر علم وفن سے خاص شغف وشغل رکھنے والے تحریری کام کیا کرتے ہیں اور یوں وہ اپنی دلچسپی کے خصوصی علوم وفنون کی گرانقدر خدمات انجام دیتے ہیں؛ لیکن حدیث سے شغف رکھنے والوں نے جس وسعت وکثرت کے ساتھ اس کو اپنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، کہ جس طرح حدیث سے متعلق دقتِ نظری اور بے شمار علوم وفنون کا استخراج واستنباط محدثین کا ایک امتیاز ہے، اسی طرح تحریر کی کثرت، پھر اس کا تنوع، یہ بھی ان کا ایک خاصہ ہی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث سے متعلق ایک ایک پہلو پر انہوں نے کئی کئی سمتوں اور جہتوں سے کام کیا ہے اور کسی ایک عالم نے ایک مختصر سا غیر مرتب کام کر دیا اور پھر راہ کھل گئی۔

بہرحال علماءِ حدیث نے حدیث و علومِ حدیث سے متعلق کثرت سے لکھا ہے

(۱) تدریب الراوی:۱/۱۵۲-۱۵۳

اور وسعت سے لکھا ہے اور ایک ایک آدمی نے ایک ایک جماعت کا کام کیا ہے، متقدمین میں علی بن مدینی کی دو سو تصانیف بتائی جاتی ہیں (۱) اور خطیب بغدادیؒ کے لیے حافظ ابن حجرؒ کا یہ جملہ بہت معروف ہے: ''قل فن من فنون الحديث إلا وقد صنف فيه كتابا مفرداً '' (۲) بعض حضرات نے ان کی مؤلفات کی تعداد ۱۰۴ ر ذکر کی ہے، بعد میں حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ کا نام وکام دونوں بہت روشن ہے؛ جو کسی پر مخفی نہیں۔

محدثین کے تحریری وتصنیفی کارناموں میں متونِ حدیث کے جمع وتدوین کا کام دیکھئے، تو ان کی کثرت ووسعت سے قطع نظر نہ جانے کتنے عنوانوں اور شکلوں سے یہ کام کیا گیا ہے اور ہر عنوان وشکل خود ذوجہات ہے، راویوں کی بنیاد پر روایت کی تلاش ہو تو مسند ومعجم ومشیخہ ان عنوانوں سے کام ملے گا، مسائل و مضامین کی بنیاد پر کسی حدیث کی تلاش ہو اور فقہیات کی حدود میں ہو تو سنن وآثار اور مؤطا ومصنف نیز جزء واجزاء کے عنوان سے کتابیں ملیں گی اور اگر فقہیات میں انحصار نہ ہو تو جوامع وغیرہ کو دیکھئے، کسی مرکزی کتاب کی روایات اور راویوں کی بنیاد پر کسی روایت کی فکر وجستجو ہو تو مستخرج ومستدرک کو لیجئے، پھر ان کتابوں کی تلخیص وتجرید اور ان کے جمع وغیرہ کا کام مزید ہے، جو مختلف انداز میں ہوا ہے اور کچھ نہیں تو بعض حضرات نے متونِ حدیث کی اہم کتابوں کی ترتیب وتہذیب ہی کا کام کرلیا ہے، جیسے مسندِ امام اعظم، مسندِ امام احمد اور صحیح ابن حبان وغیرہ کی ترتیب یا کسی امام کی روایات کے لئے یکجائی کی کوشش کی ہے، یہاں وہاں سے تلاش کر کے، جیسے مسندِ امام شافعی وسننِ شافعی کا کام، نیز امام صاحبؒ کی مسانید کا کام۔

رواتِ حدیث جن کو رجالِ حدیث بھی کہا جاتا ہے، ان سے متعلق جو مثالی اور عظیم الشان کام علماءِ امت نے کیا ہے، اس کو بھی آپ ذوجہات پائیں گے، کسی نے راویوں کے

(۱) تہذیب التہذیب:۷/۳۵۷، منہج النقد:۶۲ وغیرہ (۲) مختلف فنونِ حدیث میں ان کی کتابوں کے لیے دیکھئے: تیسیر مصطلح الحدیث اور دکتور یوسف العش کی مؤرخ بغداد ومحدثہا

ضعف وقوت کو بنیاد بنا کر اور کسی نے ان میں سے کسی ایک پہلو کو لے کر کام کیا ہے، دوسروں نے کتابوں کی بنیاد پر یہ کام کیا ہے تو کسی نے کوئی ایک اہم کتاب لے لی ہے اور کسی نے چند کتابوں کے راویوں کو لیا ہے، مزید یہ کہ کسی نے سن وار کام کیا ہے، تو کسی نے علاقہ وار اور طبقہ وار حتی کہ امتیازی صفات اور فنون کی بنیاد پر بھی رواتِ ورجال کے حالات پر کام ہوا۔

مصطلحاتِ حدیث میں آیئے تو اس بابت چھوٹی و بڑی جو عمومی کتابیں ہیں وہ تو ہیں ہی، جن میں تالیفات بھی ہیں اور شروح و تلخیصات بھی، مصطلحاتِ حدیث کے تحت جو بحثیں آتی ہیں اور جو انواع و اقسام نکلتی ہیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر سے متعلق مستقل کتابیں موجود ہیں، خواہ چند صفحات ہی کے رسالے ہوں، مگر ہیں تو مستقل تالیف۔

اس مجلس میں ہم کو خصوصیت سے مصطلحاتِ حدیث سے متعلق کتابوں اور کاوشوں کی بابت ہی گفتگو کرنی ہے۔

یوں تو حدیث کے ردّ و قبول کے اصول و ضوابط کو بیان کرنے اور ان سے کام لینے کا سلسلہ عہدِ نبوی سے ہی شروع ہو گیا تھا، جیسا کہ معروف ہے اور دن بدن اس میں وسعت و ترقی ہوئی؛ البتہ ان اصول و ضوابط کی باقاعدہ تدوین اور ان پر تالیف کا کام متونِ حدیث کی تدوین و تالیف کے کام کا ہم زمانہ ہے، جیسے جیسے متونِ حدیث کے کام میں ترقی و پختگی آئی اور وسعت پیدا ہوئی اس میں بھی ترقی ہوئی؛ جیسا کہ اس فن کی تاریخ تدوین سے ظاہر ہے، اس فن کے تفصیلی جائزہ کا یہاں موقع نہیں اور نہ اس وقت میرے لیے اس تاریخ سے متعلق کسی باقاعدہ و مستقل کتاب کا ذکر و تعارف کرانا ممکن ہے۔

البتہ اس بابت جو مختصر و مفید تذکرے میرے علم میں ہیں، ان میں اوّلین چیز حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کی تحریر ہے، جو ''نخبۃ الفکر'' پر ان کی شرح ''نزہۃ النظر'' کے مقدمہ میں آئی ہے، انھوں نے اپنے زمانے تک کی اہم تصانیف کا مختصر لفظوں میں تعارف کرایا ہے، ابن حجرؒ کی اس تحریر و تعارف کا بہت سے حضرات نے حوالہ دیا ہے۔

اس کے بعد ادھر علومِ حدیث پر جو کام ہوا ہے، خواہ کسی قدیم چیز کی اشاعت ہو یا کوئی جدید کاوش، اس کے ساتھ یا اس مقدمات میں فن تاریخ پر بھی حسبِ موقع کافی اور مفید روشنی ڈالی گئی ہے، اس بابت ڈاکٹر نور الدین عتر نے اپنی کتاب ''منهج النقد'' میں جو کچھ لکھا ہے وہ کافی اہم ہے، اس میں انھوں نے اس کام کے سات دَور قرار دیئے ہیں۔

احقر کے علم کے مطابق علومِ حدیث کی کتابوں کے ذکر و تعارف میں مختصر اور نہایت مفید و محیط جائزہ وہ ہے، جس کو جناب معظم حسین صاحب نے حاکم نیشاپوری کی کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' کی تحقیق کے مقدمہ میں پیش کیا ہے، اس مقدمہ میں تدوین حدیث اور بعض قواعدِ حدیث پر کلام کے ساتھ علومِ حدیث سے متعلق کتابوں کی بابت دو مفید چیزیں پیش کی گئی ہیں: ایک تو فن کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست جو ''رامہرمزی'' کی کتاب سے شروع ہو کر طاہر جزائری کی کتاب ''توجیہ النظر'' پر ختم ہوئی ہے، دوسرے اس وقت تک اس سلسلے کی جو کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی تھیں ان کا ذکر و تعارف بھی ہے (۱) نیز شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے ''توجیہ النظر'' کے مقدمہ میں بھی کافی تفصیل کی ہے۔

اس بابت جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ علومِ حدیث کی تدوین کے بنیادی طور پر دو دور ہیں جیسا کہ شیخ عبد الفتاح نے خصوصیت سے ''لمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث'' میں ذکر فرمایا ہے۔

ایک ابتدائی دور، جو پہلی صدی ہجری سے شروع ہو کر تیسری صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے، اس دور میں اس بابت جو کام ہوا، وہ عموماً مختصر اور ضمناً ہوا، کسی نے برائے نام کچھ چیزوں کا تذکرہ کیا اور کسی نے پھیلا کر، جس سے کسی بڑے اور باقاعدہ نیز مبسوط و جامع کام

(۱) ملاحظہ ہو: مقدمہ معرفۃ علوم الحدیث از: سید معظم حسین، مطبوعہ: دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد

کا علم نہیں ہو پاتا۔

اس دَور کی نمایاں تحریروں میں امام شافعیؒ کی ''الرسالۃ'' اور ''الأم'' کے مندرجات ہیں، اسی ذیل میں اس سلسلے کے ان قواعد کو بھی شمار کیا جائے گا جو امام محمدؒ وغیرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

اسی سلسلے کی کڑی متونِ حدیث کے بعض مجموعوں کے آغاز یا اختتام میں یا درمیان درمیان آنے والی بحثیں ہیں، جیسے امام مسلم کا مقدمہ، امام ترمذیؒ کی ''العلل الصغیر'' اور امام ترمذیؒ وغیرہ کا احادیثِ سنن پر کلام اور ابوداؤد وغیرہ کے رسائل ہیں۔

اسی طرح امام بخاریؒ کی ''الجامع الصحیح'' نیز دیگر کتابوں میں اس سلسلے کے کچھ مندرجات و مصطلحات آئے ہیں اور دوسری و تیسری صدی ہجری کے دوسرے محدثین کے یہاں بھی یہ چیزیں ملتی ہیں، جیسے ابوزرعہ دمشقی (م: ۲۸۱ھ) کی تاریخ کہ اس میں رجالِ حدیث و مصطلحاتِ حدیث سے متعلق کافی باتیں آئی ہیں، جن میں ممتاز ائمۂ فن مثلاً ابن شہاب زہریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ کے ارشادات قابلِ ذکر ہیں۔ (۱)

اور اس ابتدائی دور کے کام میں چوں کہ امام شافعیؒ کا کام اہم بھی ہے اور اس کو اولیت وسابقیت بھی حاصل ہے، اس لیے امام شافعیؒ کو اصولِ فقہ کی طرح اصولِ حدیث کا بھی اوّلین مرتب ومدوّن شمار کیا جاتا ہے۔(۲)

بعض حضرات نے ابن شہاب زہریؒ کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا ہے؛ لیکن اس کی تردید کی گئی ہے، ابن شہاب زہریؒ کو اوّلیت کا شرف متونِ حدیث کی باقاعدہ تدوین میں ہے، نہ کہ علومِ حدیث اور اُصولِ حدیث کے کام میں۔(۳)

(۱) ان چیزوں کا تذکرہ شیخ عبدالفتاح نے ''لمحات'' میں اور نورالدین عتر نے ''منہج النقد'' میں اور دوسرے حضرات نے بھی کیا ہے اور شیخ عبدالفتاح نے ابوزرعہ کی تاریخ وغیرہ سے کچھ چیزیں نقل بھی کی ہیں، ملاحظہ ہو: لمحات: ۱۰۶/۱۰۷-۱۰۸ (۲) لمحات: ۱۰۶، بحوالہ عراقی علی مقدمۃ ابن الصلاح

(۳) لمحات مع حاشیۃ: ۱۰۲، منہج النقد: ۶۰

دوسرا دَور جو چوتھی صدی ہجری یا تیسری کے اواخر سے شروع ہوتا ہے وہ علومِ حدیث واُصولِ حدیث کی تدوین اور اس بابت تالیفات کا نمایاں دَور ہے، جس میں یہ علم وفن اپنے کمال کو پہنچ گیا، اس دَور میں اس فن پر باقاعدہ مستقل اور جامع ومکمل کاوشوں کا سلسلہ شروع ہوا، جس کا آغاز ابن حجرؒ وغیرہ کی تحقیق کے مطابق ابومحمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد فارسی رامہرمزی (م: ۳۶۰ھ) سے اور ان کی کتاب ''المحدث الفاصل بین الراوی والواعی'' سے ہوا اور پھر یہ سلسلہ آج تک منتہی نہیں ہوا۔

اس لیے ان کی کتاب کو فن کی اوّلین مکمل ومحیط کتاب اور ان کو اوّلین باقاعدہ مدون کہا جاتا ہے (اور یہ اوّلیت اس اعتبار سے نہیں کہ انہوں نے تحریری کام سب سے پہلے کیا؛ بلکہ یہ اولیت کام کی نوعیت کے اعتبار سے ذکر کی جاتی ہے)۔

اس موقع سے اس بات کو واضح کردینا ضروری ہے کہ پہلے دَور کے کام کے متعلق جو یہ عرض کیا گیا کہ عموماً ضمنی تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عہد میں اس بابت استقلالاً کچھ نہیں کیا گیا اور کچھ نہیں لکھا گیا؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رامہرزی سے پہلے بھی علومِ حدیث سے متعلق استقلالاً کام کیا گیا، جو حسبِ موقع مبسوط ومفصل بھی ہوا؛ مگر اس کی بھی عمومی نوعیت یہ تھی کہ اس میں بعد کے دَور کی طرح جامعیت اور متنوع مسائل کو بیان کرنے کا لحاظ واہتمام نہیں رہا؛ بلکہ استقلالی کام بھی ایک نوع اور ایک پہلو کو لے کر کیا گیا، اس قسم کے کام ہی کی نسبت سے امام الائمہ علی بن مدینی (م: ۲۳۴ھ) کی بابت معروف ہے کہ انہوں نے علومِ حدیث پر اوّلین مرحلے میں کام کیا اور کافی کام کیا، یہ کام علومِ حدیث وفنونِ حدیث پر الگ الگ رسائل وکتابوں کی صورت میں تھا اور زیادہ تر علل کے عنوان سے مختلف شکلوں میں ہوا (۱) ابتداءِ گفتگو میں ابن المدینی کی جو دو سو تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اسی انداز

(۱) مقدمہ تحقیق برشرح ابن رجب (علل ترمذی: ۳۲-۳۳، از ڈاکٹر ہمام عبدالرحیم سعید، بحوالہ معرفۃ علوم الحدیث و علل ابن رجب

اور اسی قبیل کی ہیں۔(۱)

اس زمانے میں ان کے علاوہ بعض دوسرے ائمۂ فن نے بھی اس انداز کی خصوصی کتابیں لکھی ہیں، جیسے امام احمدؒ کی کتاب ''العلل ومعرفۃ الرجال''، ''جزء فی اُصول السنۃ'' اور امام مسلم کی ''کتاب التمییز''؛ بلکہ علل کی جملہ کتب کو اس فہرست میں لیا جاسکتا ہے؛ مگر ان سب میں یہ قدر مشترک ہے کہ یہ سارا کام دوسرے دَور کے کام کی طرح حاوی نہیں اور بالخصوص قواعد وضوابط کے اعتبار سے ان میں وسعت وجامعیت نہیں ہے۔(۲)

امام ترمذیؒ کی کتاب ''العلل الصغیر'' بھی اسی عہد ودور کی ہے؛ جیسا کہ ذکر آچکا ہے اور چونکہ یہ ان کی جامع کے ساتھ منقول چلی آرہی ہے اور اس کے ایک جزء یا تتمہ کی حیثیت سے جانی اور پڑھی جاتی ہے؛ اس لیے اس کی حیثیت ایک ضمنی کام کی قرار دی جاتی ہے۔

لیکن جامع ترمذی کے نسخوں اور ''علل صغیر'' کے سیاق وسباق کا جائزہ لینے پر یہ بات محسوس کی جاتی ہے اور ادھر بہت سے حضرات نے اس کو نمایاں طور پر ذکر بھی کیا ہے (۴) کہ امام ترمذیؒ کی ''علل صغیر'' کا معاملہ امام مسلمؒ کی جامع کے مقدمہ کی طرح نہیں ہے؛ بلکہ اس سے مختلف ہے، مقدمہ مسلم تو واقعتاً صحیح مسلم کا

ایک جزءاورآغاز ہے،لیکن امام ترمذیؒ کی علل صغیرایک استقلالی حیثیت رکھتی ہے۔

پھراس کواس اعتبار سے بھی امتیاز حاصل ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود جامع اورمختلف انواع کے مسائل کوحاوی ہے،علی بن مدینی وغیرہ کی کتابوں کی طرح کسی ایک خاص نوع سے متعلق نہیں ہے اور نہ مسلم کے مقدمہ کی طرح معدودے چند مسائل میں محدود ہے ،

(۱) لمحات:۱۰۵،وغیرہ

(۲) ملاحظہ ہو: لمحات :۱۰۶-۱۰۸،تحقیق شرح ابن رجب،از ڈاکٹر ہمام:۳۳-۳۶، منہج النقد :۶۱-۶۳

(۴) منہج النقد:۶۲-۶۳، تحقیق شرح ابن رجب وغیرہ، اس کی حیثیت مستقل کتاب کی بھی ہے اور جامع ترمذی کے مقدمہ کی بھی؛اس لیے بعض اصحابِ درس نے اب اس کو جامع سے پہلے پڑھانا شروع کردیا ہے۔

اختصار کے ساتھ اس میں فن مصطلح الحدیث کے بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں،ان دونوں پہلوؤں سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علومِ حدیث کی اوّلین باقاعدہ اورکسی قدر جامع وحاوی کاوِش جوہمارے علم میں ہے وہ امام ترمذیؒ کی علل صغیر ہے۔(۱)

اور بقولِ بعض محققین امام ترمذیؒ کواس سلسلے میں اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اس بابت صرف ''علل صغیر'' کی صورت میں مختصرسا کام نہیں کیا؛ بلکہ ''علل کبیر'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب اسی انداز میں تحریرفرمائی، پھران کی جامع کا رخ وانداز بھی اسی قسم کی کتابوں کا ہےاورمتونِ حدیث کے عام مجموعوں اورصحاحِ ستہ سے مختلف ہے،جس کی وجہ سے بعض محققین نے ان کی جامع کوسب پر فائق قرار دیا ہے۔(۲)

امام ترمذیؒ کی ''علل کبیر'' سے متعلق اس موقع سے یہ تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ ان کی اس مایۂ ناز کتاب کومفقود سمجھا جاتا رہا ہے؛لیکن اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ہمام عبدالرحیم سعید کوجزائے خیرعطا فرمائے کہ انہوں نے اس کتاب کے وجود کا پتہ چلا ہی لیا،انہوں نے علل ترمذی پر شرح ابن رجب کے مقدمہ تحقیق میں اس کتاب کے تعارف میں ذکر کیا ہے کہ یہ کتاب ترکی کے مکتبہ احمد ثالث کے مخطوطات میں موجود ہےاوراس کے بعداس کا ایک مفصل تعارف بھی اسی مقدمہ میں پیش کیا ہے۔(۳)

یہاں ایک قابل غورامر یہ ہے کہ فنِ علومِ حدیث کی اوّلین باقاعدہ ومکمل کتاب توجومعروف ہےوہ ''المحدث الفاصل '''' رامہرمزی'' کی ہے، یاجیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا امام ترمذیؒ کی '' کتاب العلل الصغیر'' ہوسکتی ہے ؛ لیکن اس بابت ایک بات یہ قابل تحقیق ہے

(۱) منہج النقد:۶۲-۶۳

(۲) مقدمہ تحقیق بر کتاب النکت علی ابن الصلاح ومقدمہ تحقیق کتاب شرح علل الترمذی لابن رجب:۳۴-۷۷

(۳) تحقیق شرح ابن رجب:۷۷-۸۴،ڈاکٹر نورالدین نے بھی منہج النقد کے اخیر میں قلمی مصادر میں اس کا تذکرہ بایں الفاظ کیا ہے: العلل الکبیر للترمذی بترتیب أبی طالب القاضی منہج النقد :۴۸۹؛لیکن کتاب سے متعلق گفتگو میں اس کومفقود بتایا ہے۔

کہ امام احمدؒ کی مؤلفات میں ایک کتاب ''جزء فی أصول السنۃ'' بھی ہے،(۱)اس کتاب کے وجود کا تو کچھ علم نہیں کہ کہیں ہے بھی یا نہیں؛لیکن نام سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس رسالے میں فن کے کچھ قواعدواصول ہی ذکر وجمع کیے گئے ہیں۔

اسی طرح مشہور حنفی فقیہ عیسیٰ بن ابان (متوفی:۲۲۰ھ)اورامام داؤد ظاہریؒ (متوفی:۲۷۰ھ) جودوسری صدی کے اواخراورتیسری صدی کے علماء میں سے ہیں،ان کی مؤلفات میں '' کتاب خبرالواحد'' کا بھی تذکرہ ملتا ہے (۲) بظاہر ان دونوں کتابوں میں خبر واحد کی شرعی حیثیت وحجیت اوراس سلسلے کے قواعد کا ہی تذکرہ ہوسکتا ہے،بہرحال مذکورہ تینوں کتابیں ہمارے سامنے نہیں اورنہ ان کی بابت کسی تفصیل کا علم ہے؛لیکن ایک خیال ان کے نام کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ یہ فن

کے قواعد واُصول کے سلسلے کی چیز ہی ہوسکتی ہیں اور اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو ''فن مصطلح الحدیث'' کی اوّلین کتابوں میں یہ تینوں کتابیں بھی شمار کی جائیں گی اور ان میں بھی باعتبار زمانہ ابن ابان کی کتاب کو اوّلیت ہوگی کہ ان کی وفات ابن المدینیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ سب سے مقدم ہے۔

اُصولِ فقہ پر جصاص رازیؒ کی کتاب ''الفصول'' کا جائزہ لینے سے اس خیال کی تصدیق ہوئی کہ ابن ابان کی کتاب ''خبر الواحد'' اور ''کتاب الرد علی بشر المریسی'' میں اسی انداز کی بحثیں ہیں؛ اس لیے کہ جصاصؒ نے اپنی کتاب کے اندر سنت کی بحث میں ابن ابان سے بہت سی باتیں نقل کی ہیں، جو مصطلح الحدیث کے باب کی ہیں اور کتاب کے مقدمہ میں جصاص کے مراجع ومصادر میں عیسیٰ بن ابان کا تذکرہ اہمیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔(۳)

(۱) اس کا تذکرہ کئی حضرات نے کیا ہے، مثلاً: عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن، ابن قدامہ وآثارہ الأصولیۃ: ۴۰ ومقدمہ تحقیق کتاب فضائل الصحابہ: ۲۶، بحوالہ تاریخ الأدب العربی

(۲) ابن قدامه وأثاره الأصولية: ۱۹، بحوالہ الأعلام والفهرست

(۳) ملاحظہ ہو: الفصول فی الأصول کا مقدمہ تحقیق (جلد اوّل)

بہر حال یہ گفتگو تو اس بابت تھی کہ علومِ حدیث و مصطلح الحدیث کی بابت تالیف وتصنیف میں سبقت واوّلیت کی سعادت کس کو حاصل ہے اور اس کی تاریخ کیا ہے؟ سابقہ گفتگو سے ہمارے سامنے یہ بات آئی کہ اس میں رامہرمزی کا نام وکام اس اعتبار سے بہر حال نمایاں ہے کہ ان کے زمانے سے اور نام سے فن پر کام کا انداز بدلا اور اس کے بعد زیادہ تر کام اسی انداز ورخ پر ہوا، اگر چہ علی بن مدینیؒ کی روشِ پر بھی لوگ چلتے رہے اور خطیب بغدادیؒ کی کثرتِ تصانیف کا راز یہی ہے کہ انہوں نے حدیث کے بہت سے علوم وفنون سے متعلق استقلالاً بہت کچھ لکھا، جیسا کہ دوسرے بہت سے حضرات نے بھی مختلف انواع واقسام میں تالیفات کی ہیں۔

لیکن چوتھی صدی ہجری سے زیادہ تر کام جامعیت اور احاطہ کے ساتھ ہوا، اس میں جو جتنا کامیاب ہوا، اس کی کتاب اتنی ہی مقبول ہوئی، حافظ ابن حجرؒ نے شرح نخبۃ میں جو جائزہ پیش کیا ہے اور جس کو بہت سے حضرات نے نقل بھی کیا ہے اور حسبِ موقع اس میں کتابوں کا اضافہ بھی کیا ہے، وہ سب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں، حتیٰ کہ خطیب بغدادیؒ نے بھی علومِ حدیث پر الگ الگ کام کے ساتھ ''الکفایۃ فی علم الروایۃ'' کے نام سے اس انداز پر بھی کام کیا ہے اور فن پر ان کے حاوی ہونے کی وجہ سے ان کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، شیخ عبدالفتاحؒ فرماتے ہیں :

> **وفي القرن الثاني بُدئ بتاليف بعض المباحث منه على شكل أبواب مستقلة في موضوعها، يجمع الموضوع الواحد منها جزء أو أجزاء تكون كتابا لطيفا بمقياسنا اليوم ...... و في أوائل القرن الرابع توجهت أنظار بعض العلماء إلى جمع تلك المباحث والقواعد المتفرقة في كتاب جامع ناظم لمسائل هذا العلم ، ومن اوّل من دوّن فيه تدوينا مستقلا الحافظ القاضي البارع الذوّاقة أحد أئمة هذا الشأن أبو محمد الحسن بن عبد الرحمٰن بن خلاد الفارسي الرا مهرمزی...... ثم تتابع فيه التاليف وتعدد فيه التصنيف . (۱)**

اس موقع سے یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علومِ حدیث و مصطلح الحدیث میں تالیف وتحریر کی بابت کام کا ایک رخ، جس کو علماءِ اُصولِ فقہ نے اُصولی کتابوں میں مبحث السنۃ کے تحت اختیار کیا ہے، وہ بھی اسی قبیل کی چیز ہے؛ کیوں کہ اُصولِ فقہ میں کتاب وسنت سے استدلال اور استنباط واستخراج مسائل کے قواعد واُصول بیان کیے جاتے ہیں اور علومِ الحدیث و مصطلح الحدیث کے بنیادی قواعد بھی اسی مقصد سے وضع کیے گئے ہیں؛ اس لیے علومِ حدیث کی تالیف و تدوین کی کوششوں میں ان کتابوں کو بھی شمار کیا جائے گا، اگر چہ اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مندرج اس حصہ کی حقیقت دورِ اوّل کے کام کی طرح ہے، اس اعتبار سے کہ یہ ان میں ایک ضمنی چیز ہے کہ ان کتابوں میں کتاب واجماع اور اجتہاد وقیاس کی بحثوں کے ساتھ ایک بحث یہ بھی آتی ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ اس کے لیے اس اعتبار سے استقلال بھی ہے کہ اُصولِ فقہ کی کتابوں کا مقصد اسی قسم کے اُصول وقواعد کو بیان کرنا ہے، جب کہ علومِ حدیث کی تالیف میں دورِ اوّل کا کام زیادہ تر متونِ حدیث کی جمع وتحقیق کے کام کے ضمن میں یا رجال کے تذکروں کے ضمن میں ہوا ہے۔

بالخصوص فقہاءِ حنفیہ نے تو علومِ حدیث پر زیادہ تر کام اصولِ فقہ کی کتابوں کی صورت میں ہی کیا ہے، اگر چہ انہوں نے اپنی اپنی صلاحیت اور ذوق ومزاج کے مطابق خوب خوب دادِ تحقیق حاصل کی ہے اور اس بابت انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ ایک مبسوط کام کا جزء ہی تو ہے اس لئے اس کو مختصر ہی رکھا جائے؛ بلکہ تالیف کے مقصد کی رعایت کے ساتھ کافی لمبی لمبی بحثیں فرمائی ہیں۔

(۱) لمحات من تاريخ السنة وعلوم الحديث:۱۰۱-۱۱۰

چونکہ حنفیہ کا زیادہ تر کام اصولِ فقہ کے ضمن میں ہوا ہے؛ اس لیے علومِ حدیث و مصطلح الحدیث میں ہم کو حنفیہ کی مستقل تالیفات بہت کم ملتی ہیں اور اُصولِ فقہ کی کتابوں میں اس بابت ان کی نادر تحقیقات مل جاتی ہیں، اس کے باوجود اس حیثیت سے لوگ ان سے کم استفادہ کرتے ہیں؛ کیونکہ ان کتابوں کو عموماً اس اعتبار سے نہیں دیکھا جاتا۔

بات آگئی ہے تو اس سلسلے کی دو اہم کتابوں کا ذکر وتعارف فائدہ سے خالی نہ ہوگا، یوں تو فقہ حنفی کے اصول کی تمام کتابوں میں اس بابت بہت اچھی اور محدثانہ انداز میں بحثیں ملیں گی، مثلاً ''التحریر'' اور اس کی شرح، نیز ''مسلم الثبوت'' اور اس کی شروح وغیرہ؛ لیکن اس موقع سے فن کی دو مفصل کتابوں کا ذکر مقصود ہے، ایک ابوبکر جصاص رازیؒ (متوفی:۳۷۰ھ) کی کتاب اور دوسری شمس الائمہ سرخسیؒ (متوفی:۴۹۰ھ) کی کتاب۔

ابوبکر جصاصؒ کا نام بحیثیتِ مفسر وفقیہ معروف ہے، ان کی کتاب '' **أحكـام القرآن** '' موضوع کی اوّلین شائع ہونے والی کتابوں میں اور بہت متداول ہے، اسی کے مقدمہ کے طور پر ان کی کتاب اصول پر ''**الفصول في الأصول** '' معروف ہے جو کویت سے چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کی تیسری جلد:۳۱-۲۱۲ تک سنت کی بحث میں ہے، ویسے تو اس کے بعد بھی کچھ حصہ ہے جس میں آنے والی گفتگو محض فقہی واصولی نقطۂ نظر سے ہے؛ مگر اس سے قبل کا حصہ اسی انداز کی بحثوں پر مشتمل ہے؛ بلکہ فی الجملہ اس اُسلوب پر بھی مشتمل ہے جو علوم الحدیث و مصطلح الحدیث کا امتیاز ہے اور خیال رہے کہ جصاص، رامہرمزی کے فی الجملہ ہم عصر ہیں، جصاص کی وفات ۳۷۰ھ میں اور رامہرمزی کی ۳۶۰ھ ذکر کی جاتی ہے۔

شمس الائمہ سرخسیؒ کا نام بھی معروف ہے، اصول میں ان کی کتاب ''اصول السرخسی'' کے نام سے معروف ہے اور اوّلین اشاعت حیدرآباد سے مولانا ابوالوفاء افغانی صاحب کی سعی سے اور ان کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں ہوئی ہے، اس کتاب کا بھی تقریباً ایک ربع حصہ مصطلح الحدیث کی تفصیلات اور بحثوں پر مشتمل ہے۔(۱)

اس مناسبت سے چند ان کتابوں کا ذکر بھی کردینا مناسب ومفید ہے جو اس فن کی مؤلفات میں شمار ہوتی ہیں اور ان کے مؤلفین حنفیہ میں سے ہیں، یا یہ کہ ان میں ان اصول وقواعد کو اہتمام سے ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن سے فقہِ حنفی میں کام لیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ کے رسائل میں ایک تو رضی الدین محمد بن ابراہیم حلبی معروف بہ ابن الحنبلی (متوفی:۹۷۱ھ) کا رسالہ ''**قفو الأثر** '' ہے اور دوسرا علامہ مرتضیٰ حسینی زبیدی بلگرامیؒ (متوفی:۱۲۵۴ھ) کا رسالہ ''**بـغية الأريب** '' ہے(۲) یہ دونوں رسالے حافظ ابن حجرؒ کی نخبۃ کے انداز پر ہیں، ان دونوں حضرات سے پہلے سید شریف جرجانیؒ (متوفی:۸۱۶ھ) نے بھی اصول پر ایک رسالہ لکھا ہے، جو ''مختصر الجرجانی'' کے نام سے معروف ومطبوع ہے، بعض علماء نے نخبۃ ونزہۃ کی شرح کا کام کیا ہے؛ لیکن اس میں حسبِ موقع حنفیہ کے اصول وقواعد کو نمایاں کیا ہے، مثلاً ملا علی قاری (متوفی:۱۰۱۴ھ) قاضی محمد اکرم سندھی (از علماءِ قرن:۱۱) اور قاسم بن قطلوبغا (متوفی:۸۷۹ھ کی شروح، قاضی اکرم کی شرح ''امعان النظر'' (جو طبع شدہ ہے اور نیز تحقیق مسائل اور زیر بحث پہلو کے اعتبار سے زیادہ اہم ہے) ملا علی قاریؒ کی شرح ''**مصطلحات أهل الأثر علی شرح نخبة الفكر** '' (یہ بھی مطبوع ہے) اور ابوالحسن سندھیؒ (متوفی:۱۱۳۸ھ) کی شرح۔

ادھر سو سال کے عرصے میں برصغیر میں جو علمی کام بالخصوص حدیث سے متعلق ہوا ہے، اس میں یہ فن بھی توجہ سے محروم نہیں رہا؛ بلکہ اس پر بھی بڑے اہتمام سے کام ہوا ہے اور خصوصیت سے اہم متونِ حدیث کی جو شروح تالیف کی گئی ہیں، ان کے مقدمات اس

(۱) ایک داعیہ عرصہ سے ہے کہ اُصول السرخسی کا یہ حصہ استقلالاً شائع ہوجاتا تو بہت اچھا ہوتا۔

(۲) یہ دونوں رسالے بہت پہلے مصر سے شائع ہوئے تھے، ایک مرتبہ شیخ عبدالفتاحؒ سے تذکرہ ہوا تو انہوں نے ازراہِ عنایت سابقہ ایڈیشن کی فوٹو کاپی سے نوازا اور اس کے بعد اس کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائی۔

سلسلے کی اہم کڑی ہیں، جن میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی شرح مسلم ''**فتح الملهم** '' کا مقدمہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، جیسا کہ شیخ عبدالفتاحؒ فرمایا کرتے تھے۔(۱)

یہ مستقل اشاعت شیخ عبدالفتاحؒ کے حواشی وتحقیقات سے مزین ہے، جیسے کہ شیخؒ کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ اس سلسلے کی ایک دوسری اہم چیز بھی شائع ہوئی ہے، یعنی سید شریف جرجانی کے رسالہ پر مولانا عبدالحئ صاحب لکھنویؒ کی شرح جو ظفر الامانی کے نام سے معروف ہے، اس میں اگر چہ فقہِ حنفی کے اصول کی بنیاد پر اہتماماً کام نہیں ہوا؛ لیکن شرح فی نفسہ بڑی اہم ہے اور ممتاز علماءِ عرب نے بھی اس کو بہت سراہا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔(۲)

شیخ نے ''قفوا الأثر ''اور''بغیة الأریب ''کو بھی اہتمام سے شائع کیا ہے؛ مگر بس متن کی تصحیح وغیرہ کی حد تک اور''قفوا الأثر '' کی بہت تعریف فرمائی ہے، فرمایا ہے کہ یہ ماسبق تمام کتابوں کا خلاصہ اور لب لباب ہے؛ اس لیے''قفو الأثر وصفو علوم الأثر '' ہے۔(۳)

جہاں تک سوال فن کی اہم کتابوں کے تعارف کا ہے (چہ جائیکہ جملہ معروف کتب) تو یہ دشوار طلب کام ہے، کچھ تو اپنی بے بضاعتی کا معاملہ اور کچھ اس وجہ سے کہ متقدمین سے لے کر متاخرین اور دوسرے دور کی ابتداء سے لے کر قریبی عہد تک، فن کے ممتاز لوگوں نے بڑی گرانقدر کتابیں لکھی ہیں، جن میں متعدد کتابیں اپنی جگہ شاہکار ہیں؛ اس لیے چند نہایت معروف کتابوں کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں، جو فی الحال ذہن میں اور سامنے ہیں اور وہ طبع شدہ بھی ہیں اور ان کے تعارف میں بھی اپنا کام نقل کا ہی سمجھئے ، اس تعارف کو المحدث الفاصل سے

(۱) اور شیخ علیہ الرحمہ''اعلاء السنن'' کے مقدمہ کی طرح اس کی بھی مستقلاً اشاعت کے لئے خواہشمند اور فکر مند تھے''توجیه النظر '' کے مقدمہ میں اس کی تعریف وتوصیف فرمائی ہے۔

(۲) مقدمہ ظفر الامانی از: مولانا تقی الدین ندوی:۱۹ (۳) مقدمہ قفوا الاثر ،از: شیخ عبد الفتاح:۲۹

شروع کرتا ہوں اور زمانے کی ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے تعارف پیش کرتا ہوں :

(۱) **المحدث الفاصل بين الراوي والواعي** :اس کا تذکرہ بار بار آچکا ہے، اس کے مصنف چوتھی صدی ہجری کے ایک معروف عالم ابومحمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد فارسی رامہرمزی ہیں، ان کا سن ولادت (۲۶۵ھ) کے آس پاس اور وفات (۳۶۰ھ) کے قریب ذکر کی گئی ہے، ایران سے جنوب مغرب میں واقع ایک علاقہ ''خوزستان'' کے نواحی میں ایک مقام ''رام ہرمز'' ہے، یہ وہیں کے رہنے والے تھے۔

جیسا کہ بار بار آچکا ہے کہ فن علومِ حدیث پر معروف اوّلین جامع کتاب یہی ہے اور اس وقت تک اس سے بڑی وسیع کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی (جیسا کہ بظاہر سمجھا جاتا ہے) اگر چہ اس کتاب میں فن کے قواعد کا اس طرح احاطہ نہیں کیا گیا جیسا کہ بعد میں مزید ہوا، اس کتاب کے اندر مصنف نے راوی کے آداب وشرائط، محدث کے آداب وشرائط، حدیث کے تحمل وحصول کی صورتیں اور پھر اس کو بیان کرنے کی صورتیں وغیرہ، نیز حدیث کی اوّلین کتب ومصنفین کا تذکرہ کیا ہے۔

(۲) **معرفة علوم الحديث** :یہ ابوعبداللہ حاکم محمد بن عبداللہ الحافظ نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) کی معروف تصنیف ہے، فن علومِ حدیث کو تصنیف و تالیف کی رُو سے باقاعدگی اور باضابطگی عطا کرنے میں اس کتاب کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، جیسا کہ اس سلسلہ میں حافظ کا قول معروف ہے، اگر چہ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کی کتاب میں تہذیب اور حسن ترتیب نہیں ہے اور بہت سی انواع چھوٹ بھی گئی ہیں، پھر بھی یہ کتاب رامہرمزی کی کتاب سے زیادہ وسعت واحاطہ کی حامل ہے اور حسن انداز سے بھی خالی نہیں ہے؛ اسی لیے ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں ان کو اور ان کے اس کام کو سراہا ہے۔(۱)

(۱) مقدمه تحقیق معرفة علوم الحديث

اس کی اوّلین اشاعت دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی سرکردگی میں، ڈاکٹر معظم حسین صاحب کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ مصر سے ہوئی ہے۔

(۳) **الكفاية في علم الرواية**:یہ ابوبکر احمد بن علیؒ (متوفی ۴۶۳ھ) معروف بہ ''خطیب بغدادیؒ'' کی تصنیف ہے، خطیب بغدادیؒ کو اللہ تعالیٰ نے علومِ حدیث میں خاص مناسبت وملکہ سے نوازا تھا، پیچھے آچکا ہے کہ انہوں نے اکثر علوم وفنون میں مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس کی وجہ سے اور پھر سابقہ کام بھی سامنے تھا، ان سب کی بنا پر ان کی یہ کتاب بہت جامع وحاوی مانی گئی؛ بلکہ بعد کے زمانے اور کام کے اعتبار سے بھی اس کو سب سے بڑا مانا گیا، اس میں انہوں نے فن کے قواعد واصول کو تفصیل وتحقیق کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس بابت اختلافات وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس کی بھی اوّلین اشاعت ہندوستان میں ہوئی ہے۔

(۴) **علوم الحديث معروف به مقدمه ابن الصلاح**: یہ مشہور فقیہ ومحدث ابوعمرو عثمان بن الصلاح شہرزوریؒ (متوفی ۶۴۳ھ) کی تالیف ہے، مصنف کی عظمت کے ساتھ اس کتاب میں ان کے خصوصی ذوق وادراک واجتہاد نے وہ رنگ بھرا ہے کہ بعد کے بڑے بڑے ائمۂ فن نے بھی مستقل اور نیا کام

حجرؒ نے بھی اس کی شرح وتوضیح کا کام کیا ہے، علامہ سیوطیؒ کی مشہور ومعروف کتاب ''تدریب الراوی'' اسی کے ایک ملخص ''تقریب'' (تالیف امام نوویؒ) کی شرح ہے، اس کتاب کی اہمیت کے لیے نخبہ کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ کا بیان کافی ہے۔

اس کی بھی اوّلین اشاعت ہندوستان سے اور مشہور مایۂ ناز عالم ومحقق اور فقیہ ومحدث مولانا عبدالحئ صاحب لکھنوی کی دلچسپی سے ۱۳۰۴ھ میں ہوئی، اس کے بعد مصر سے ٹائپ پر شائع ہوئی، ڈاکٹر نورالدین عتر نے اس کتاب کی تین اہم خصوصیات ذکر فرمائی ہیں :

(۱) متقدمین علماء کے اقوال سے ان کے مذاہب وقواعد کا استنباط واستخراج۔

(۲) دقتِ نظر کے ساتھ علوم وفنون کی تعریفات۔

(۳) مخالف اقوال کا تحقیقی اور مجتہدانہ جائزہ۔

حالانکہ ان کی اس کتاب کا معاملہ یہ ہے کہ یہ باقاعدہ طور پر ان کے قلم سے لکھی ہوئی نہیں؛ بلکہ املا کرائی ہوئی ہے اور تالیف کا ذہن ہی کچھ اور ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اس میں ترتیب کے تناسب میں کمی محسوس کی جاتی ہے، مگر کتاب کی انتہائی افادیت وجامعیت کی وجہ سے یہ کمی رجوعِ عام اور قبولِ عام سے مانع نہیں بنی، کتاب کے متعلقات سے واقفیت کے لیے ''معرفۃ علوم الحدیث'' (طبع ہند) کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیے۔

(۴) **ألفية العراقي المسمى بـ " التبصرة والتذكرة "**: مقدمہ ابن الصلاح پر اضافہ وتعقب کے ساتھ، یہ ابن الصلاح کی کتاب کی منظوم شکل ہے، حافظ عراقی عبدالرحیم بن حسین (م:۸۰۶ھ) نے یہ کام کیا ہے اور پھر اس کو اپنی دو شرحوں سے مزین کیا ہے: ایک شرح منظومہ پر ہے اور دوسری اصل ابن الصلاح کی کتاب پر، جو ''التقييد والإيضاح لما أطلق وأغلق من كتاب ابن الصلاح '' کے نام سے معروف ہے، ''ألفيه'' اور مذکورہ دونوں شروح طبع شدہ ہیں، عراقی کی ''ألفيه'' اور اس کی مشہور شرح ''فتح المغيث '' بھی اوّلاً ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں، ''فتح المغيث '' حافظ ابن حجرؒ کے مشہور شاگرد اور مایۂ ناز محدث شمس الدین سخاویؒ کی ہے، یہ شرح پہلے لیتھو پر، اس کے بعد ٹائپ پر شائع ہوئی ہے۔

(۵) **نخبة الفكر مع شرحه نزهة النظر** : یعنی حافظ ابن حجرؒ کا مشہور رسالہ اور اس کی شرح، چنانچہ ابن صلاح کے مقدمہ کے بعد اس جیسی مرجعیت جس کتاب کو حاصل ہوئی، وہ یہی رسالہ ہے، جب کہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی مقدمہ ابن الصلاح پر ''الافصاح'' کے نام سے کام کیا ہے اور مدینہ یونیورسٹی سے تحقیق وتعلیق کے ساتھ اس کی اشاعت ہوچکی ہے، نخبہ کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، کہ آپ اس سے خوب واقف ہیں۔

(۶) **تدريب الراوی** : امام نوویؒ نے ابن الصلاحؒ کے مقدمہ کا ایک ملخص ''الارشاد'' کے نام سے تیار کیا، اس کے بعد اس خلاصہ کا ''**خلاصة التقريب والتيسير لأحاديث البشير والنذير** '' کے نام سے تالیف فرمایا، اسی خلاصۃ الخلاصہ کی شرح علامہ سیوطی (متوفی:۹۱۱ھ) نے ''تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی'' کے نام سے لکھی ہے، سیوطی عموماً جمع ونقل کا کام کیا کرتے ہیں، یہ کام بھی اسی انداز کا ہے؛ لیکن ان کے سامنے سابقہ تمام چیزیں ہیں، اس کی وجہ سے یہ کتاب فن میں بڑی جامع ومفید قرار پائی اور بہت مقبول ومتداول ہے، یہ سب سے پہلے مصر سے ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوئی، اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ کتاب دوسری بہت سی کتابوں سے مستغنی رکھتی ہے۔

(۷) **توضيح الأفكار** : مصنفہ محمد اسماعیل صنعانی (متوفی:۱۱۸۲ھ) یہ کتاب ''**تنقيح الأنظار في علوم الآثار** '' کی شرح ہے، جو محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الوزیر (متوفی ۸۴۰ھ) کا تالیف کردہ متن ہے، توضیح الافکار، مصنف کے مقام اور پھر شرح کے کام کی وجہ سے فن کی اہم ومفید کتابوں میں شمار ہوتی ہے، یہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔

(۸) **توجيه النظر إلى أصول الأثر** : یہ علامہ طاہر جزائری (م:۱۳۳۷ھ) کی تالیف ہے اور ''ختامہ مسک'' کی مصداق ہے، کہ دورِ ثانی کا جو نہج علومِ حدیث کی تالیف کا چلا، اس کی بنیاد پر جو کام ہوتا رہا، اس سلسلے کی ایک طرح سے آخری کڑی ہے اور ساتھ ہی تمام معروف وممتاز کتب کی خصوصیات وافادات کی حامل ہے اور اس میں کچھ نئی بحثیں بھی آئی ہیں یا قدیم بحثیں نئے انداز پر اور مزید تفصیل کے ساتھ آئی ہیں، بہت سے حضرات نے اس کی اہمیت وافادیت کی تذکرہ کیا ہے(۱) یہ بھی پہلی بار مصر سے شائع ہوئی ہے۔

(۱) ملاحظہ ہو: مقدمہ تحقیق معرفۃ علوم الحدیث، طبع: حیدرآباد، شیخ عبدالفتاح نے اس کتاب کو بھی اپنی تحقیق و

تعلیق کے ساتھ شائع فرمایا ہے اور مقدمہ تحقیق میں اس کی بڑی تعریف وتوصیف فرمائی ہے، اس کا امتیاز جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، نئے رخ وانداز کے ساتھ سابق تمام کوششوں کی جامعیت ہے۔

(۹) قواعد التحدیث: کتابوں کے اس تعارف کو یہ احقر علامہ جمال الدین قاسمی (متوفی:۱۳۳۲ھ) کی کتاب ''قواعد التحدیث'' کے ذکر پر ختم کرتا ہے اور وہ اس لیے کہ یہ کتاب دوسرے دَور کے طرزِ تالیف کی نمائندہ ونمونہ تو ہے ہی، ساتھ ہی یہ خود ایک اُسوہ اور قابل تقلید نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اس لیے کہ اس عہد کے حالات نے مختلف علومِ اسلامیہ کی بابت کچھ جدید رخ پیدا کیے اور ان کی رو سے سوچنے اور لکھنے پر اہل علم اور اہل صلاحیت کو مجبور کیا؛ چنانچہ معلوم ہے کہ اس عہد میں قدیم دورِ اوّل اور دورِ ثانی کا جو کام تھا، اس انداز کے کام کے ساتھ بہت سی گرانقدر کوششیں بھی کی گئی ہیں اور بالکل نئے انداز اور اچھوتے موضوعات کو لے کر محققین نے تالیف وتحقیق کا کام کیا ہے، کتاب ''قواعد التحدیث'' اس سلسلے کی اوّلین گرانقدر ومفید اور معقول ومقبول کوشش ہے؛ چنانچہ ڈاکٹر نورالدین صاحب نے اس کی بابت اس تاثر کا اظہار کیا ہے :

كان فى ذٰلک قدوة للكاتبين فى هذا الفن من المعاصرين . (۱)

(۱۱) تیسیر اور تعارف کا تتمہ ڈاکٹر محمود طحان کی کتاب ''تیسیر مصطلح الحدیث'' کو بناتا ہوں کہ یہ کتاب دورِ ثانی کی جامعیت کے ساتھ اس دَور کے نئے اُسلوب سے آراستہ ہے، احقر سمجھتا ہے کہ آپ حضرات بھی اس کتاب سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں۔

فن کی اہم کتابوں کے تعارف کے ساتھ علماءِ ہند کی جو کاوشیں ہیں، ان کا بھی استحضار کر لیجیے کہ وہ ملتِ ہندیہ اسلامیہ کا قیمتی علمی سرمایہ ہیں، کتابوں کے تفصیلی تعارف سے پہلے احناف کی خدمات کے بیان میں جن چیزوں کا تذکرہ آیا ہے، ان میں سے اکثر برصغیر ہند و پاک کے علماء کی ہی جدوجہد کا ثمرہ ہیں، یعنی ''بـــــغية الأريـــــب'' مرتضیٰ بلگرامی کی اور قاضی اکرم وشیخ ابوالحسن سندھی کی شروح نخبۃ، نیز ''قواعد فی علوم الحدیث'' مولانا ظفر احمد

(۱) منهج النقد:۱۷

تھانویؒ کی اور ''ظفر الأمانی'' مولانا عبدالحیؒ صاحب لکھنوی کی، نیز انہیں کی ''الرفع والتكميل فى الجرح والتعديل'' بھی ہے، جس کو بڑی اہمیت حاصل ہے؛ بلکہ تفرد وامتیاز بھی، مولانا عبدالحی صاحب کی کتابیں اپنی وسعت وجامعیت کے ساتھ بڑی ہی نافع وگرانقدر شمار کی جاتی ہیں، علماءِ ہند کی مؤلفات سے تفصیلی واقفیت کے لیے ''نزہۃ الخواطر'' اور ''الثقافة الإسلامية فى الهند'' کا مطالعہ کیا جائے، احقر کی کتاب ''علوم الحدیث'' میں بھی مناسب تعارف آیا ہے۔

اس طویل گفتگو کو سابقہ تفصیلات وتذکرۂ کتب کی نسبت سے دو باتوں کے ذکر پر ختم کرتا ہوں :

اول : یہ کہ فن کو کمال تک پہنچانے اور اس کو مہذب ومرتب کرنے اور پھیلانے وبڑھانے میں جن حضرات کی خدمات بڑی اہم ونمایاں ہیں، ان میں سرفہرست تین حضرات ہیں، ان حضرات کے کام اور آراء وتحقیقات کو بعد میں بڑا اعتماد واستناد حاصل رہا ہے۔

اول: ابوعبداللہ حاکم : ابن خلدونؒ نے ان کے متعلق لکھا ہے :

ومن ...... علمائه و ائمتهم أبو عبد الله الحاكم وتأليفه فيه مشهور وهو الذى هذبه و أظهر محاسنه . (۱)

اور شیخ طاہر جزائری فرماتے ہیں :

فيه فوائد مهمة رائعة ، ينبغى لمطالعى هذا الفن الوقوف عليه . (۲)

دوم: خطیب بغدادی: خطیب بغدادی کے متعلق حافظ ابن حجرؒ کا جملہ معروف ہے کہ علومِ حدیث کا شاید ہی کوئی شعبہ ہو، جس میں ان کی کتاب نہ ہو اور حافظ ابن نقطہ کا یہ قول

(۱) مقدمه ابن خلدون:۳۷۱، منهج النقد:۶۵

(۲) مقدمه نزهة ، شرح نخبة وغيره

بھی، جس کو ابن حجرؒ اور دوسرے حضرات نے نقل کیا ہے: ''کل من أنصف علم أن المحدثین بعد الخطیب عیال علی کتبه''۔

''ڈاکٹر نورالدین عترؒ'' ان دونوں کے متعلق فرماتے ہیں :

وكـان مـن أبـرز الأعـلام الـذين شيدوا بنيان علوم الحديث فى هذا الدور ، واعتمد عليهم من جاء بعدهم الحاكم النيسابورى والخطيب البغدادى . (۱)

سوم: ابن الصلاح، ابن الصلاح کا معاملہ یہ ہے کہ دورِ ثانی کے کام کو بامِ عروج تک پہنچانے والا یا یوں کہا جائے کہ فن کے کمال کے بعد اس کو ایک نیا رخ دینے والا جو باکمال شخص ہوا، وہ ابن الصلاح ہیں، ان کی امتیازی کتاب اور اس کے خصائص کا تذکرہ آچکا ہے، اس کو بعض محققین نے ان لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

هكذا جاء كتابه متكاملاً فى التصنيف ، وكان فتحاً فى تدوين هذا العلم ، وابتداء عهد جديد له ،نال من العلماء حـظـوة وطـارت شهـرتـه فـى الآفـاق وعـم الثناء عليه حتى صار صاحبه يعرف به فيقال " صاحب كتاب علوم الحديث " . (۲)

چہارم: حافظ ابن حجرؒ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے اور ان کا نام لینا حق و بجا ہے :

اسی طرح جن کتابوں کو مرجعیت اور قبولیتِ عامہ کا شرف حاصل ہوا اور جن کا نفع بہت عام ہوا وہ کتابیں بھی تین ہیں :

اول: ابن الصلاح کی مقدمۃ علوم الحدیث، جس کا تعارف اور اس کے بارے میں کچھ تفصیل آچکی ہے، آپ نے حافظ ابن حجرؒ کی شرح نخبۃ میں اس کی بابت پڑھا ہے :

(۱) منهج النقد:۶۴ (۲) منهج النقد:۶۶

عـكـف الـنـاس عـليه وسارو بسيره فلا يحصى كم من ناظم له ومختصر ومستدرك عليه ومقتصر ومعارض له ومنتصر .

واقعہ یہی ہے کہ ابن الصلاحؒ کی اس کتاب کے آجانے کے بعد پھر فن اور کام پر وہ اور ان کی کتاب ہی چھائی رہی، چاہے جس انداز میں ہو؛ چنانچہ نور الدین عتر لکھتے ہیں :

وقد أصبح الكتاب إماما يحتذى ، ومرجعا يقتدى به ، فعول عليه كل من جاء بعده ، فمنهم من اختصره ، ومنهم مـن نـظـمـه شـعـرا ، ومنهم من شرحه وعلق عليه ؛ لكن المصنفين فى هذا الدور أى بعد ابن الصلاح كانوا كما قدمنا أئمة أجلة ، فلم يقلدوه فى القواعد العلمية ؛ بل اجتهدوا رأيهم وكثيرا ما ناقشوه أو خالفوه فيما قرره . (۱)

حافظ زین الدین عراقیؒ نے اس کو ایک ہزار شعروں میں منظوم کیا ہے، جو ''ألفية العراقى'' کے نام سے معروف ہے، پھر اس منظومہ کی خود انہوں نے اور حافظ سخاویؒ نے، نیز سیوطی و شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ وغیرہ نے شرح لکھی ہے اور خود اصل کتاب پر عراقی، زرکشی اور حافظ ابن حجرؒ کی شروح ہیں اور بدرالدین ابن جماعۃ، امام نوویؒ اور بلقینیؒ وغیرہ نے اختصار کیا ہے، امام نوویؒ نے دو اختصار کیے ہیں، دوسرا اختصار جو ''التقريب والتيسير'' کے نام سے معروف ہے، اس پر متعدد ائمہ فن، مثلاً: عراقی، سخاویؒ اور سیوطیؒ وغیرہ کی شروح ہیں سید معظم حسین صاحب نے مقدمہ ''معرفة علوم الحديث'' میں اور شیخ عبدالفتاح نے توجیہ النظر کے مقدمہ میں ابن صلاحؒ کی کتاب کے متعلقات کا تفصیل سے

(۱) منهج النقد:۶۶-۶۷

تذکرہ کیا ہے۔(۱)

دوم: حافظ ابن حجرؒ کی ''نخبة الفكر ونزهة النظر'' — نخبۃ کی مقبولیت کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، بالخصوص تعلیم کے اس انقلابی عہد میں عرب و عجم ہر جگہ یہ شاملِ نصاب رہی ہے اور ہے، اس کی وجہ سے اس کی طرف توجہ اور اس کی خدمت کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے اور ہے اور مختلف زبانوں میں اس

پر کام ہو چکا ہے، عربی میں اس صدی سے پیشتر تک جو کام ہوا وہ تو اپنی جگہ اہم ہے، اس کے علاوہ ابن الصلاحؒ کے مقدمہ کی طرح اس کی خدمت بھی حافظ کے زمانے سے ہی ممتاز علماء نے مختلف انداز میں کی ہے، کئی حضرات نے اس کو منظوم کیا، مثلاً کمال الدین الشمنی (الکبیر) اور ابوالفضل غزی وغیرہ، پھر منظومہ کی متعدد حضرات نے شرح کی ہے اور اصل کتاب و رسالہ کی شروحات تو معروف ہیں ہی (۲) ہندوستان کے ممتاز علماء میں شیخ وجیہ الدین علوی، قاضی محمد اکرم سندھی ابوالحسن سندھی اور شیخ عبدالنبی اکبرآبادی وغیرہ نے شرح کی ہے، مولوی محمد حسین ہزاروی نے فارسی میں شرح کی ہے، اردو میں بھی کئی شروح لکھی گئی ہیں، ابھی حال میں ہماری اسلامک فقہ اکیڈمی کے رفیق مولانا ابوسفیان مفتاحی کی بھی شرح عربی میں آئی ہے اور بلادِ عرب میں اس کے متعدد ایڈیشن مختلف حضرات کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، شیخ عبدالفتاح نے توجیہ النظر کے مقدمہ میں اس کے متعلقات کا بھی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ (۳)

اس سلسلے کی تیسری کتاب اور آخری کڑی ''تیسیر مصطلح الحدیث'' ہے، جس کا تذکرہ آچکا ہے، اس وقت اس کتاب کو قبولِ عام حاصل ہو چکا ہے اور بلادِ عرب کی جامعات کے علاوہ ہند و پاک کے مدارس میں بھی اس کی طرف توجہ خاص مبذول ہے اور اس کو شامل

(۱) ملاحظہ ہو: مقدمه تحقيق بر معرفة علوم الحديث ، نيز مقدمه توجيه النظر

(۲) ملاحظہ ہو: مقدمہ تحقیق بر معرفۃ علوم الحدیث

(۳) مقدمه توجيه النظر بتحقيق الشيخ عبد الفتاح: ۲۴-۲۹

نصاب کیا جارہا ہے، اس کی وجہ کتاب کی جامعیت کے ساتھ اس کا خاص اُسلوب و اندازِ تحریر ہے، جس کی وجہ سے جن بحثوں تک پہنچنے اور پڑھنے سے طالب علم نخبہ وغیرہ میں آج کل اُکتا جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، اس کتاب میں ان کو وہ بڑی دلچسپی سے پڑھ کر کتاب کو مکمل کر لیتا ہے اور اس طرح فن سے مکمل تعارف حاصل کر لیتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

اسناد — اہمیت اور حیثیت

''اسناد'' یعنی کسی بات کو اس کے قائل اور واسطہ در واسطہ نقل کرنے والوں کی طرف نسبت کرکے بیان کرنا، اس کی ہر زمانے میں اور ہر علم وفن میں اہمیت رہی ہے؛ اسی لیے مقولہ مشہور ہے؛ بلکہ یہ ایک قاعدۂ مسلمہ کی حیثیت اختیار کرگیا ہے کہ: ''إن کنت ناقلاً فالصحة ، أو مدعیا فالدلیل '' (اگر بات کے ناقل ہو تو نقل کا ثبوت پیش کرو اور اگر اپنی بات کہہ رہے ہو تو دلیل دو)۔

اس لیے کہ کوئی بھی بات جب کہنے والے کے ذاتی غور وفکر کا نتیجہ ہوگی تو اس کی حیثیت کچھ اور ہوگی اور اس کے لیے دلیل تو پوچھی جائے گی، مگر سند نہیں اور اس پر اعتماد دلیل کی بنیاد پر کیا جائے گا، مگر جب وہی بات آدمی کسی کی طرف نسبت کرکے نقل و بیان کرے گا یا اپنی فکر ورائے کی تائید میں کسی کے قول کو ذکر کرے گا تو اس پر اعتماد واستناد کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی سند بیان کرے، یعنی یہ ذکر کرے کہ اس بات کا علم اس کو کس سے ہوا اور کن واسطوں سے ہوا؟ پھر ان واسطوں کو دیکھا و پرکھا جائے گا، چنانچہ کسی بھی علم وفن کے قدیم مسئلے یا قدیم کتاب کے لیے جب تک سند نہ ہو، اس کا معاملہ پایۂ ثبوت واطمینان تک نہیں پہنچتا، حتی کہ حکایات وواقعات کی حیثیت بھی سند کی وجہ سے بدل جاتی ہے، کچھ تو ثبوت کی تحقیق وطلب ایک فطری امر ہے اور کچھ بعد کے حالات نے احادیث کی طرح دیگر علوم میں بھی اس کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔

مولانا عبدالحیؒ صاحب کی ''الأجوبة الفاضلة '' میں پہلے سوال وجواب کے تحت احادیث کے علاوہ دیگر علوم وامور میں بھی اس کی اہمیت کی کافی وضاحت کی گئی ہے(۱) اور جواب کو مولانا نے ان لفظوں پر ختم کیا ہے:

> **خلاصة المرام فی تحقیق المقام أن الأمور الدینیة بأسرها محتاجة إلی بروز سندها واتصالها إلی منبعها أو تصریح من یعتمد علیه بها ولا یستثنی من ذٰلک شیٔ منها ، غایة الأمر أن منها ما یشدد ویحتاط فی طریق ثبوتها ومنها ما یتساهل أدنی تساهل فی طریقها .**

شیخ عبدالفتاح ایک موقع پر فرماتے ہیں :

> **وقد نشأ عن اهتمام المحدثین بالإسناد و وضوح أهمیته فی تلقی المنقول أن اشترط الإسناد فی تلقی سائر العلوم الإسلامیة کالتفسیر والفقه والتاریخ والرجال والأنساب واللغة والنحو والأدب والشعر وأخبار المضحکین ونوادر الطفیلین کما دخل فی سیاق الکلمة الواحدة فی التفسیر . (۲)**

حتیٰ کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ تحریرِ فتاویٰ اور نقلِ مفتی کے لیے بھی سند ضروری ہے اور اس کے بغیر فتویٰ درست نہیں، البتہ اس میں عموم ہے کہ براہِ راست سند ہی ذکر کی جائے یا اس کی جگہ استناد واعتماد سے کام لیا جائے، جب کہ وہ سند کے درجہ میں ہو، چنانچہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :

> **طریق نقله ...... أی المفتی عن المجتهد ...... أحد**

(۱) الأجوبة الفاضلة مع تحقیق الشیخ عبد الفتاح:۶۴-۶۵

(۲) لمحات من تاریخ السنة:۷۸، شیخ نے اس کے بعد مثالیں بھی پیش فرمائی ہیں۔

> **أمرین إمّا أن یکون له سند أو یأخذ من کتاب معروف تداولته الأیدی نحو کتب محمد بن الحسن ونحوها من التصانیف المشهورة للمجتهدین ؛ لأنه بمنزلة الخبر المتواتر عنه أو المشهور . (۱)**

لیکن علم حدیث کی نسبت سے اسناد کو امتیاز واختصاص حاصل ہے کہ حدیث کے لیے جس کثرت ووسعت کے ساتھ اور تقریباً ابتداءِ عہد سے ہی — اس لیے کہ عہدِ صحابہ میں ہی اس کا اہتمام شروع ہوگیا تھا — (۲) اس کا استعمال ہوا، یہ استعمال کسی علم وفن کے حصے میں نہیں آیا اور خصوصیت سے روایاتِ احکام میں اور حدیث میں سند کو وہ اہمیت دی گئی کہ سند حدیث کے لیے جزءِ لازم بن گئی اور یہ صرف علومِ حدیث کا ہی خاصہ نہیں قرار پائی؛ بلکہ امتِ محمدیہ کی ایک خصوصیت

اور چوں کہ شریعت کے اصل مصادر دو ہی ہیں: قرآن وحدیث (کتاب وسنت) اور پھر ایک تو احادیث کا ذخیرہ قرآنی آیات سے کہیں زیادہ ہے، دوسرے یہ کہ احادیث قرآن کریم کی شرح وبیان ہیں، قرآن فہمی اور قرآن سے شرعی مسائل واحکام کو نکالنے وسمجھنے کے لیے احادیث سے واقفیت ضروری ہے اور احادیث کا حصول معتد بہ طریقے پر سند ہی کے واسطے سے ہوسکتا ہے، اس لیے ''الأسـنـاد مـن الـديـن'' ایک مسلمہ اُصول بن گیا، جو

(۱) الأجوبة الفاضلة:۶۱،نقلا عن فتح القدير ، كتاب أدب القاضی

(۲) امام مسلمؒ نے مقدمہ صحیح میں عبداللہ بن عباس کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اس کی وضاحت ہوتی ہے اور ابن سیرین کا ایک قول جو امام مسلمؒ نے مقدمہ میں نقل کیا ہے اور معروف ہے، اس کا مضمون و مدلول بھی یہی ہے جس کی اپنے لفظوں میں شیخ عبدالفتاح نے وضاحت کی ہے(لـمحات من تاريخ و السنه :۳۷-۳۹) ابن سیرینؒ کا قول ہے کہ لوگ یعنی صحابہؓ سند کی بابت نہیں سوال کیا کرتے تھے مگر فتنہ (قتل عثمانؓ) کے بعد کہنے لگے کہ بتاؤ کس سے سنا؟

(۳) اس بابت بہت سے حضرات کے اقوال کتابوں میں ملتے ہیں، مثلاً سیوطیؒ نے کئی اقوال نقل کیے ہیں، اسی طرح مولانا عبدالحئ صاحب نے الأجوبة الفاضلة میں:۲۱-۲۶

اصلاً تو عبداللہ بن مبارکؒ کا ارشاد ہے؛ لیکن حالات کی بناپر اس کو قبولِ عام حاصل ہوا؛ کیوں کہ سلف وخلف سب نے ہی قولاً وفعلاً ہر طرح سے اس کی تائید وتاکید کی اور پھر حدیث کے سماع وحصول میں یہ ضروری قرار پایا کہ اس کو سند کے ساتھ ذکر کیا جائے اور سند کے ساتھ حاصل کیا جائے اور جو سند کے بغیر سنائے اس کو روک کر سند کو دریافت کیا جائے اور سند نہ بتائے تو اس کی بات کو رد کر دیا جائے، چنانچہ کتابوں میں ''الأسـنـاد من الدين'' کے بیان کے ساتھ یہ ساری تفصیلات آپ کو مل جائیں گی اور دین میں احادیث کی اہمیت اور احادیث کے لیے سند واسناد کی اہمیت کی بناپر یہ بھی آیا ہے:''إن هـذه الأحاديث دين ، فـانظروا عمن تأخذون دينكم''۔(۱)

اس موقع سے ایک امر کی طرف توجہ دلانا نفع سے خالی نہ ہوگا، وہ یہ کہ اس سلسلے کے اقوال میں عبداللہ بن مبارک سے ایک عبارت ترمذی وغیرہ میں نقل کی گئی ہے، اس کے سمجھنے میں کافی ردّوکد ہوا ہے، کہ لفظ کیا صحیح ہے اور پھر اس کا کیا مطلب ہے۔(۲)

الأسناد عندی من الدين و لولا الأسناد ، لقال من شاء ما شاء ، فإذا قيل له من حدثك بقی .(۳)

اس کو متعدد حضرات نے نقل کیا ہے، آخری لفظ میں ترمذی کے نسخوں میں بھی اختلاف ہے اور دیگر کتابوں میں بھی، پھر اس کی توضیح میں بھی اختلاف ہے، شیخ عبد الفتاح

(۱) مـراجـع سـابـقه ، نیز لمحات سن تاريخ السنة و رساله الاسناد من الدين از شیخ عبد الفتاح، بعض کتب وطرق میں إن هذا العلم دين آیاہے۔

(۲) اس کو امام ترمذیؒ نے شمائل میں ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے اور ''منهج النقد'' میں آیا ہے کہ ابن ابی حاتم نے اس کو متعدد تابعین سے نقل کیا ہے، منهج النقد:۵۵

(۳) ابن مبارکؒ کا یہ ارشاد بہت معروف ہے، آخری ٹکڑے کے بغیر اس کو امام مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور

آخری ٹکڑے کے ساتھ ترمذی نے ''علل ''میں اور ذہبی نے ''تذکرة الحفاظ ''میں ذکر کیا ہے، تعلیقات الأجوبة:۲۱،۲۲

نے اس بابت کئی مواقع میں کلام فرمایا ہے اور ان کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ لفظ ''بقی'' ہی صحیح ہے اور یہ ایک قدیم محاورہ رہا ہے، جو حیرانی و پریشانی کے مفہوم کو ادا کرتا ہے، شیخ نے اس کے شواہد کا بھی تذکرہ کیا ہے۔(۱)

بہر حال حدیث کے لیے سند کی اہمیت کے ثابت ہونے اور لازم ہونے کی بنا پر یہ بات عام ہوگئی کہ حدیث کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک سند اور ایک متن اور علومِ حدیث کے موضوع میں دونوں داخل ہیں، خواہ روایتِ حدیث کا مسئلہ ہو یا درایتِ حدیث کا معاملہ، حدیث پر اعتماد کے لیے سند اور متن دونوں کی تحقیق و تفتیش کی جاتی ہے، یعنی راوی کو بھی دیکھا و پرکھا جاتا ہے اور روایت کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے، چنانچہ ہم تمام متونِ حدیث کی کتابوں میں دیکھتے ہیں کہ محدثین جو روایات ذکر کرتے ہیں وہ سند کے ساتھ ہوتی ہیں اور اس میں وہ اس کا لحاظ نہیں کرتے کے سند بہت لمبی ہو رہی ہے تو چھوڑ دیا جائے، حالانکہ بسا اوقات متن سند سے کہیں مختصر ہوتا ہے، وہ ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ سند تو بنیاد ہوتی ہے، جس کو ضابطہ کے مطابق ہی رکھا جاتا ہے، اگر چہ ایسا نہیں ہے کہ ائمہ ٔ فن نے اپنی کتابوں میں سند کو مختصر کر کے یا سند کو حذف کر کے، کوئی حدیث نقل نہ کی ہو، ایسا ہوا ہے اور بہت ہوا ہے مگر اس چیز نے ایسی کتابوں یا ایسی روایات کے مرتبے کو کم از کم سرسری نظر و ظاہری صورت میں متاثر کیا ہے، خواہ امام مالکؒ کی بلاغات ہوں یا امام بخاریؒ کی معلقات۔(۲)

اب آیئے اس امر کی طرف کہ سند کا حدیث سے جو یہ گہرا ربط و تعلق ہے، اس کی آخری حد کیا ہے؟ اور اس کی اہمیت کا کیا مطلب ہے؟ ایا یہ کہ سند ہی سب کچھ ہے ، وہی متن حدیث اور اس کے اعتبار و اعتماد کا معیارِ کلی ہے اور صحت و سقم کا دارومدار سند ہی پر ہے کہ سند صحیح ہے

(۱) تعلیقات الأجوبة:۲۱،۲۹،۳۰،لمحات من تاریخ السنة :۷۰،الأسناد من الدین:۵۳-۷۴،سب سے زیادہ تفصیل اسی میں ہے۔

(۲) بخاری کی معلقات کے لیے فتح الباری اور حافظ کی ''النکت علی ابن الصلاح ''وغیرہ اور بلاغاتِ مؤطا کے لیے شروح مؤطا ''اوجز'' وغیرہ دیکھی جائیں۔

تو متن کو صحیح مانا جائے گا، ورنہ متن کو ضعیف و مردود قرار دیا جائے گا یا اس اہمیت کا حاصل یہ ہے کہ متن کی صحت کو پرکھنے اور جاننے کا یہ واحد و کلی ذریعہ نہیں بلکہ ایک نہایت اہم ذریعہ ہے، لہٰذا اس پر سارا دارومدار نہیں؛ بلکہ اس کے ساتھ بعض دوسرے اُمور کو بھی دیکھا جاتا ہے۔

ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ سند، اس کی بحثیں اور اس سے متعلقہ قواعد وضوابط سے ہٹ کر کچھ نہیں سوچا جاسکتا اور ان کی روشنی میں ہی کسی حدیث کی صحت وضعف کا فیصلہ کیا جائے گا اور اسی بنیاد پر کسی متن کو قبول کیا جائے گا اور ان قواعد سے ہٹ کر جو حدیث ہوگی یا جس کی سند ہوگی اس کو ضعیف قرار دیا جائے گا اور اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

یہ جماعت اپنے نظریہ پر بڑی سختی سے کاربند ہے، بلکہ اس بابت اس حد تک متشدد ہے کہ اگر کسی حدیث کی سند ورواۃ کے حق میں یہ آجائے، مثلاً ''رجاله رجال الصحیح إلا عاصم بن بهدلة ''تو حدیث کو ایک طرف کر دیتے ہیں، جب کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس حدیث کے رواۃ بخاری کے رواۃ ہیں، البتہ عاصم بن بہدلہ بخاری کے راویوں میں نہیں ہیں۔

تو اوّلاً تو یہ حکم وقاعدہ نہیں کہ بخاری کی روایات ورواۃ پر ہی صحت کا مدار ہے؛ بلکہ اس سے باہر بے شمار رواۃ ثقہ اور انتہائی معتبر ہیں، جن میں بہت سے ان راویوں کے بعد ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں یہ لکھا ہے وہاں آگے یہ بھی موجود ہے ''إلا عاصم بن بهدلة وهو ثقة — أو أنه ثقة —'' اور رجال کی کتب میں ان کی ثقاہت کی صراحت موجود ہے(۱) مگر لفظ ''إلا'' نے چکی گھما دی۔

(۱) **تقریب التھذیب:۱/۳۸۳،فیه عاصم بن بھدلة وھو ابن أبی النجود الأسدی مولاھم الکوفی ، أبوبکر المقرئ صدوق له أوھام ، حجة فی القراء ة و حدیثه فی الصحیحین مقرون من السادسة مات:۱۲۸ھ**

دوسری جماعت کا موقف یہ ہے کہ سند کی اہمیت مسلم، مگر یہ نظریہ کہ سند ہی سب کچھ ہے اور اس کے ماسوا کچھ نہیں، یہ درست نہیں ہے، یہ مسئلہ کے حق میں غلو یا غلط فہمی ہے جس پر اصرار بے جا ہے اور یہی رائے درست ہے۔

۱- اسی کی محدثین کی تصریحات سے تائید ہوتی ہے۔

۲- ان کے طرزِ عمل سے تائید ہوتی ہے۔

۳- کسی بھی علم وفن میں قواعد ہی میں انحصار نہیں ہے۔

۴- اس میں بہت سے مفاسد ہیں کہ اس پر اصرار کے نتیجے میں بعض ایسے اُمور کو ماننا وتسلیم کرنا پڑے گا جو شرعی یا تاریخی مسلمات کے خلاف ہیں، اس بابت طاہر جزائری نے توجیہ النظر میں اچھی وضاحت کی ہے اور تین فرقے ذکر کیے ہیں، حاصل وہی ہے جس کو اس موقع سے ذکر کیا گیا۔(۱)

ہر علم وفن میں متعینہ قواعد سے الگ بھی کچھ چیزیں ملتی ہیں، خواہ ان کو کچھ بھی عنوان دیا جائے، جیسے نحو وغیرہ میں شواذ اور فقہ میں ضوابط وقواعد سے استثناء ات۔

جہاں تک سوال ہے محدثین وائمۂ فن کی طرف سے اس دوسری رائے کی تائید کا تو اس بابت متفرق عبارتیں اور اقوال کو نقل کرنے کے بعد چند مثالیں بھی ذکر کی جائیں گی، ان حضرات کی تصریحات ومعمولات کا حاصل یہ ہے کہ سند مطلوب ہے اعتبار واستناد کے لیے نہ یہ کہ وہ خود مقصود ہے، اسی لیے سند اور رواۃ کی تحقیق صرف حضراتِ صحابہؓ تک ہوتی ہے اور ان کا نام آنے پر پھر ساری بحث ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا جب کسی چیز کے ثبوت کا اطمینان ویقین حاصل ہو جائے یا کم از کم غلبۂ ظن، تو اگر چہ رسمی قواعد وضوابط ساتھ نہ دیتے ہوں، پھر بھی اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، اس بابت ہر عہد میں محققین نے صراحتیں کی ہیں؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ محدثین نے ابتداءِ عہد سے جو فنی قواعد و ضوابط اہتمام کے ساتھ ذکر کیے ہیں

(۱) **توجیه النظر:۱/۱۷-۱۸**

خود ان میں ایسے قواعد بھی موجود ہیں جو اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ صرف سند ہی کو نہ دیکھا جائے اور نہ اس پر مدار رکھا جائے۔

احادیث اور دیگر علوم میں سند کی اہمیت کے بیان کے ضمن میں عزالدین بن عبدالسلام سے نقل کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں :

و أما الإعتماد علی کتب الفقه الصحیحة الموثوق بھا فقد اتفق العلماء فی ھذا العصر علی جواز الإعتماد علیھا والإستناد إلیھا ؛ لأن الثقة قد حصلت بھا کما تحصل بالروایة ؛ ولذلک اعتمد الناس علی الکتب المشھورة فی النحو واللغة والطب وسائر العلوم ؛ لحصول الثقة بھا وبعد التدلیس ومن زعم أن الناس اتفقوا علی الخطأ فی ذٰلک فھو أولی بالخطأ منھم ، و لو لا جواز الإعتماد علی ذٰلک ، لتعطل کثیر من المصالح المتعلقة بھا وقد رجع الشارع إلی قول الأطباء فی صور ولیست کتبھم ماخوذة فی الأصل إلا عن قوم کفار ؛ ولکن لما بعد التدلیس فیھا اعتمد علیھا ، کما اعتمد فی اللغة علی أشعار العرب وھم کفار ؛ لبعد التدلیس ...... وکتب الحدیث أولی بذلک من کتب الفقه وغیرھا ؛ لاعتنائھم بضبط النسخ وتحریرھا فمن قال : إن شرط التخریج من کتاب یتوقف علی اتصال السند إلیه فقد خرق الإجماع . (۱)

(۱) **الأجوبة الفاضلة:۶۳-۶۴، تدریب الراوی:۱/۱۵۲**

امام دہلوی شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں :

صحيحا كردّ مافيه أدنى شائبة الإرسال والإنقطاع وكقولهم فلان أحفظ لحديث فلان من غيره فيرجحون حديثه على حديث غيره لذٰلک وإن كان فى الأخر ألف وجه من الرجحان . (۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

أما أهل العلم فلايصدقون بالنقل و يكذبون بمجرد موافقة ما يعتقدون بل قد ينقل الرجل أحاديث كثيرة فيها فضائل النبى صلى اللّٰه عليه وسلم و أصحابه فيردونها ؛ لعلمهم بأنها كذب ، و يقبلون أحاديث كثيرة ؛ لصحتها و إن كان ظاهرها بخلاف ما يعتقدون ، إما ؛ لإعتقادهم أنها منسوخة أولها تفسير لايخالفونه و نحو ذٰلک .

فالأصل فى النقل أن يرجع فيه إلى أئمة النقل وعلمائه و أن يستدل على الصحة والضعف بدليل منفصل عن الرواية فلابد من هذا و هذا ، وإلا فمجرد قول القائل رواه فلان لايحتج به لا أهل السنة ولا الشيعة و ليس فى المسلمين من يحتج بكل حديث

(۱) حجة الله البالغة:۱/۱۵۶

رواه كل مصنف فكل حديث نطالبه فى أول مقام بصحته . (۱)

مولانا عبدالحیؒ لکھنوی فرماتے ہیں :

إن كان لابد للإسناد فى كل أمر من أمور الدين ؛ لكن قد يقوم مقامه نقل من يعتمد عليه و تصريح من يستند إليه لاسيما فى الأعصار المتاخرة ؛ لفوات اهتمام الإسناد فيها بالشروط المقررة ، فإن شدد فيها بطلب الإسناد فى كل أمر فات المراد فيكتفىٰ بتصريح من عليه الإعتماد . (۲)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں :

كان الإنساد ؛ لئلا يدخل فى الدين ما ليس منه لا ليخرج من الدين ما ثبت منه من عمل أهل الإسناد . (۳)

نیز فرماتے ہیں :

إنما القواعد للفصل فيما لم ينكشف أمره من الخارج على وجهه .(۴)

ایک موقعہ پر ان سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے :

یہ بھی خوب یاد رکھنا چاہیے کہ قوتِ سند پر اغترار اور تعامل سلف سے اغماض بہت دفعہ مضر ثابت ہوا ہے کہ اسناد تو دین کی صیانت

(۱) منهاج السنة:۴/۱۲،قواعد فى علوم الحديث:۴-۲۷۵

(۲) الأجوبة الفاضلة:۵۹-۶۰

(۳) الأجوبة الفاضلة:۲۳۸، فيض البارى:۳/۴۰۹

(۴) الأجوبة الفاضلة:۲۳۸، فيض البارى :۳/۴۰۹

کے لیے تھی، پس لوگوں نے اس کو پکڑا حتی کہ تعامل سے اغماض ہوتا چلا گیا، حالانکہ میرے نزدیک فیصلہ تعامل سے ہی ہوسکتا ہے۔

(۱)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے سمعانی کا قول نقل کیا ہے :

ابوالحسن ابن الحصار المالکی فرماتے ہیں :

قد يعلم الفقيه صحة الحديث إذا لم يكن في سنده كذاب ؛ لموافقة آية من كتب الله أو بعض أصول الشريعة فيحمله ذلك على قبوله و العمل به . (۳)

امام مالکؒ کا یہ ارشاد بہت معروف ہے: ''**شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سنده**''۔(۴)

علامہ انور شاہؒ نے ترمذی کی ایک حدیث کے تحت فرمایا ہے :

ذلك يدلنا على أن أصحاب الفن ربما يحكمون على الحديث نظرا إلى أذواقهم الخاصة ولايراعون القواعد العامة والأصول المدوّنة . (۵)

ذوق والی بات متعدد محققین اور ائمۂ فن نے ذکر فرمائی ہے(۶) اور اُصولِ حدیث کی کتابوں میں علل و معلل کے بیان میں یہ بات بہت معروف ہے کہ بسا اوقات صاحب ِ فن کو حدیث کے پرکھنے کا وہ ملکہ ہوتا ہے جو ایک صراف کو کھرے وکھوٹے سونے کے درمیان

(۱) ملفوظاتِ محدث کشمیری:۳۴۳ (۲) فتح الملهم:۱۶/۱

(۳) الأجوبة الفاضلة ، التعليقات:۲۲۸ (۴) سنن دارقطني:۴۴۱/۲

(۵) معارف السنن:۲۹۳/۲ (۶) أسماء الرجال:۴۷-۴۹

امتیاز کی بابت حاصل ہوتا ہے اور اس طرح کہ وہ اپنے ذوق سے صحیح وغلط، کھرے وکھوٹے کا فیصلہ کر دیتا ہے، اگرچہ وہ تفصیلات نہ بتا سکے۔(۱)

اب یہاں پہنچ کر ایک معروف قاعدہ ذہن نشین کر لیجئے —— جس کو ائمۂ فن نے متعدد کتابوں میں ذکر کیا ہے اور اصولِ حدیث و مصطلح الحدیث کی مبسوط و جامع کتب میں اس کا تذکرہ ضرور مل جائے گا — کہ سند کی صحت متن کی صحت کو اور سند کا ضعف متن کے ضعف کو مستلزم نہیں ہے، بسا اوقات سند و متن کا معاملہ ایک دوسرے کے برعکس ہوتا ہے۔(۲)

حافظ ابن حجرؒ ''نکت'' میں فرماتے ہیں :

لايلزم من كون رجال الإسناد من رجال الصحيح أن يكون الحديث الوارد به صحيحا ؛ لاحتمال أن يكون فيه شذوذ أو علة . (۳)

علامہ ابن الہمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں :

إن وصف الحسن و الصحيح و الضعيف إنما هو بإعتبار السند ظنا ، أما في الواقع فيجوز غلط الصحيح وصحة الضعيف . (۴)

طاہر جزائری فرماتے ہیں :

قد يقوى الخبر وأصله ضعيف، وقد يضعف وأصله قوي . (۵)

نیز ان کا یہ بھی ارشاد ہے :

إن في كثير من الأحاديث الضعيفة ماهو صحيح

(۱) نخبة ونزهة وغیرہ منهج النقد میں اس بابت کئی عبارتیں ذکر کی گئی ہیں منهج النقد:۴۵۲-۴۵۳

(۲) الرفع و التكميل:۱۸۷-۱۹۱ (۳) النكت:۲۷۴

(۴) فتح القدير:۳۸۹/۱ (۵) توجيه النظر:۴۷

المعنى فيصح المبنى . (۱)

یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سی احادیث کے حق میں محققین وائمۂ فن کا یہ فیصلہ دیکھتے ہیں کہ فلاں حدیث سنداً تو صحیح نہیں ہے؛ لیکن معنیً صحیح ہے(۲) جیسے کہ بکثرت یہ فیصلہ سامنے آتا ہے کہ حدیث کی سند یا سندیں تو ضعیف ہیں مگر تعداد تقاضا کرتی ہے کہ اس کی اصل ضرور ہے یا یہ کہ ثابت ہے۔

اس بابت عبارات وتصریحات کی نقل کے سلسلے کو میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی ایک عبارت پر ختم کرتا ہوں، جو اگر چہ کچھ طویل ہے؛ لیکن اس میں دونوں ہی پہلو یعنی سند کی اہمیت اور متن کی پرکھ دونوں آ گئے ہیں، فرماتے ہیں :

إن المحدثين الجهابذة قالوا بالنقد للرواة تجريحا وتعديلاً وردّا وقبولا ، ورسموا في شأن الرواة قواعد وضوابط مدهشة تبارت فيها الأذهان المرهفة الدقيقة اللامعة و القرائح المشرقة التقية الصالحة ، فجاء ت على أحسن ما يرام و أدق ما ينبغي و أوفى ما تكون .

لقد كان صنيعهم هذا نحو نقد السند أوالإسناد ، أوالراوي ، وهم إلى جانب إقامتهم هذا الأس الهام جدّا ، أقاموا أُسًّا أخر في كشف الحديث الصحيح من المزيّف والقوي من المضعّف ، لايقل في أهميته عن الأسّ السابق و لا يستغني عنه في بعض الأحيان بل قد يكون هو الفيصل في الأمر و هو ما يسمونه

(۱) توجيه النظر:۳۷

(۲) ملاحظہ ہو:كشف الخفاء:۱/۱۲۴، ملفوظات محدثِ کشمیری:۲۱۱، بابت حديث لولاك ، لما خلقت الأفلاك اسی طرح حب الوطن من الایمان وغیرہ کے متعلق

نقد المتن . (۱)

اور شیخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ محدثین نے حدیث کی صحت وقبول کے لیے جو ایک شرط شذوذ وعلت سے خالی ہونے کی رکھی ہے اور اسی طرح حدیث موضوع کے پرکھنے اور وضع کے جاننے کے قرائن میں جو بہت سے امور ذکر کیے ہیں، ان سب کا مبنی بھی یہی ہے کہ بات صرف ''سند'' کی صورت وصحت کی نہیں ہوتی بلکہ دوسرے اُمور بھی دیکھے جاتے ہیں۔(۲)

اس کے ساتھ ابن رجب حنبلیؒ کا بھی ارشاد سنتے چلیے :

حذاق النقاد من الحفاظ لكثرة ممارستهم للحديث ومعرفتهم للرجال وأحاديث كل واحد منهم لهم فهم خاص يفهمون به أن هذا الحديث يشبه حديث فلان ، ولايشبه حديث فلان فيعللون الأحاديث بذلک ...... و إنما يرجع فيه إلى مجرد الفهم والمعرفة التي خصوا بها عن سائر أهل العلم . (۳)

بہرحال سند کی اہمیت اپنی جگہ، سند کو پرکھنے کے قواعد سب درست؛ لیکن اس پر انحصار واصرار بے جا ہے، یہاں بھی وہی کہا جائے گا جو نحوی وفقہی قواعد کے لیے مشہور ہے کہ کوئی قاعدہ کلی نہیں بلکہ اکثری ہوتا ہے، سند کے تمام تر حسن وخوبی اور قوت کے باوجود کبھی دوسرا فیصلہ کرنا پڑتا ہے، اسی طرح سند کی کھلی ہوئی خامی و کمزوری کے باوجود متن پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ ایسے قرائن وتصریحات ومسلمات ہوتے ہیں، جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) فتح القدير:۱/۳۸۹-۱۴۳، فتح الباری:۸/۴۳۹ (۲) لمحات من تاريخ السنة:۸۷

(۳) شرح علل الترمذی، تحقیق نورالدين عتر:۷۵۶، منهج النقد:۴۵۲

اب آیئے ان مثالوں کی طرف جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ انحصار واصرار بڑی غلطی وگمراہی کا باعث بن سکتا ہے اور بنے گا، محققین نے ان مثالوں وروایتوں کا تذکرہ اس بحث کے ضمن میں بھی کیا ہے اور اس کے بغیر بھی، یہاں ان مثالوں سے تعرض نہیں کیا جارہا ہے، جن میں قواعد سے ہٹ کر روایت کی صحت وحسن کو اور اس پر اعتماد کو اپنایا گیا ہے، دوسری مجلس میں اس کی بات آسکتی ہے۔ چند سال پیشتر احقر نے ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا تھا، اس کے ابتدائی حصے

صحیح مسلم ’’كتاب صفة المنافقين وأحكامهم ‘‘میں ایک روایت آئی ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو سنیچر کے دن پیدا فرمایا، امام بخاریؒ وغیرہ نے اس کی تردید کی ہے، ابن تیمیہؒ اور ابن کثیرؒ نے اس پر نقد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی سند سے زیادہ صحیح سند سے یہ بات مروی ہے کہ خلقت کا آغاز یکشنبہ سے ہے اور کتاب وسنت واجماع سے صرف چھ دن میں کائنات کی پیدائش اور جمعہ پر اس کا اختتام ثابت ہے۔(۲)

اور عجیب بات یہ کہ امام نوویؒ حدیث کی شرح کرتے ہوئے گذر گئے ہیں اور اس بابت کچھ نہیں فرمایا ہے۔(۳)

اسی طرح صحیح مسلم کتاب المناقب میں ایک روایت حضرت ابوسفیان کے متعلق آئی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب وہ اسلام لے آئے اور عام مسلمانوں میں خود سے دوری وبیزاری محسوس کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں کا مطالبہ کیا، ان میں سے ایک حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کرنا تھا، جب کہ معلوم ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح بہت پہلے ہوچکا تھا ، اس لیے اس پر بھی امام ذہبی ، ابن تیمیہ ، ابن قیم ،

(۱) یہ بحث البعث الاسلامی میں شائع ہوچکی ہے، مستقل اشاعت کی نوبت نہیں آسکی ہے۔

(۲) قاعدة جليلة في التوسل والوسيلة :۸۶، تعلیقات علی قواعد فی علوم الحدیث:۲۸۸، ابن کثیر: ۹۴/۴

(۳) شرح نووی علی صحیح مسلم:۱۳۲/۷

ابن کثیر اور ابن حزم وغیرہ نے سخت نقد کیا ہے۔ امام نوویؒ نے ابن حزم سے نقل کیا ہے :

هذا الحديث وهم من بعض الرواة ؛ لأنه لاخلاف بين الناس أن النبى صلى الله عليه وسلم تزوّج أمّ حبيبة قبل الفتح بدهر وهي بأرض الحبشة وأبوها كافر . (۱)

جامع ترمذی (أبواب المناقب، باب ماجاء فی بدء نبوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک روایت آئی ہے، جس کو امام ترمذیؒ نے حسن کہا ہے اور دوسرے حضرات نے سند کی صحت اور رواۃ کی ثقاہت کا تذکرہ کیا ہے، اس میں یہ آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صغرسنی میں چچا کے ساتھ جب شام کا سفر کیا اور بحیرہ راہب نے اصرار کرکے آپ کو واپس کرایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت بلالؓ کو بھیجا۔ (۲)

ظاہر ہے کہ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۱۲/سال تھی، ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسال چھوٹے تھے، بلال رضی اللہ عنہ تو اور بھی کم عمر تھے بلکہ اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، تو عمر کے اعتبار سے ان کا ساتھ ہونا ممکن نہیں، چہ جائیکہ یہ حال ومعاملہ ہو کہ ابوبکرؓ بلال کو ساتھ بھیجیں، اسی لیے اس کی تردید کی گئی ہے، ذہبیؒ، ابن القیمؒ اور حافظ ابن حجر وغیرہ سب نے نقد ورد کیا ہے، تحفۃ الأحوذی میں آیا ہے :

إسناده صحيح و رجاله رجال الصحيح أو أحدهما ، وذكر أبى بكر وبلال فيه غير محفوظ وعده أئمتنا وهما وهو كذلك . (۳)

(۱) ميزان الإعتدال:۹۳/۳، مجموع الفتاوىٰ:۲۵۶/۱، قواعد فی علوم الحدیث:۲۸۸-۲۸۹، شرح نووی:۶۳/۱۶-۶۴ وغیرہ

(۲) ترمذی میں یہی مضمون ہے؛ البتہ مسندِ احمد کی ایک روایت میں ہے: ’’فردّہ مع رجل‘‘ اور مسندِ بزار میں ہے: أرسل معه رجلاً ، تحفة الأحوذي:۹۳/۱۰

(۳) تحفة الأحوذي:۹۳/۱۰، لمعات علی ہامش جامع ترمذی، طبع ہند:۲۰۲/۲، الإصابة:۱۷۷/۱

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بسا اوقات حضرات صحابہ کرامؓ بھی سامنے آنے والی روایت کو ان بنیادوں پر رد کردیا کرتے تھے، کبھی جس موقع پر

بات کہی گئی اس کے سیاق وسباق کی وجہ سے، کبھی تاریخ وزمانہ کو یاد کر کے اور ذکر کر کے اور کبھی دوسری نصوص واحکام کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس سلسلے کا اہم واقعہ وہ ہے جو طلاق کی روایات واحکام کے ضمن میں آیا ہے کہ ایک صحابیہؓ نے جب یہ کہا کہ مطلقہ ثلاثہ کو نفقہ وسکنیٰ کچھ نہیں ملے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا ہے، تو حضرت عمرؓ نے اس کی سختی سے تردید فرمائی اور فرمایا :

لاندع كتاب ربنا وسنة نبينا صلى الله عليه وسلم لقول امرأة لاندری أحفظت أم نسيت ؟ (۱)

اب سوال یہ ہے کہ یہ کام یعنی قواعد وضوابط سے ہٹ کر کسی حدیث کا اعتبار ورد کا فیصلہ کون کرے اور اس کا حق کس کو ہے؟ تو یہ معاملہ بڑا نازک ہے، نفس قواعد سے مکمل واقفیت اور ان کی بنیاد پر جانچ وپرکھ نازک کام ہے، اسی لیے حدیث کی تصحیح وتحسین اور تضعیف وتسقیم کے کام میں ہر ایک پر اعتماد نہیں کیا گیا، بڑے بڑے ماہرین فن کے فیصلوں پر بھی نظر ثانی کے بعد ہی کوئی بات قبول کی گئی، جیسا کہ آپ جانتے ہیں (۲) جب کہ یہ فیصلے عام ضوابط وقواعد کے مطابق ہوئے، تو یہ مرحلہ تو اور بھی ذمہ داری اور نزاکت کا ہے اس کے لیے تو بڑی جامعیت اور وسعت علم اور دقتِ نظر کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ بسا اوقات اچھے اچھے صاحبِ فن، اہل نظر اور اہل بصیرت بھی چوک جاتے ہیں اور پھر یا تو سند کے

(۱) یہ روایت مسلم اور ترمذی وغیرہ میں آئی ہے، حضرت عمر رضی اللہ کے علاوہ حضرت عائشہؓ وغیرہ سے بھی نکیر و انکار مروی ہے، إعلاء السنن :۱۱/۹۴-۲۹۹، اسی قبیل سے وہ روایات ہیں جن میں حضرت عائشہؓ کا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بعض روایات پر نقد آیا ہے، ملاحظہ ہو: ترمذی ، كتاب الحج و باب ماجاء فی عمرة رجب ، كتاب الجنائز ، باب ماجاء فی الرخصة فی البكاء علی الميت

(۲) جیسے حاکم وغیرہ کا معاملہ معروف ہے۔

حسن میں کھوجاتے ہیں ــــ خواہ اس روایت کا حاصل کچھ نکلتا ہو اور اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور پھر گھما پھرا کر بات کو بنانے کی سعی کرتے ہیں ــــ یا سند سے صرفِ نظر کر کے فیصلہ کرتے ہیں ــــ تو وہ بھی صحیح نہیں ہوتا ــــ اسی لیے شیخ عبدالفتاح نے ''لمحات من تاریخ السنۃ'' میں ''متن کے نقد'' پر گفتگو کرتے ہوئے مثالیں وغیرہ دینے کے بعد فرمایا ہے :

ومما ينبغي التنبيه عليه هنا أن سبر المتن كما رأيت فی هذا الكتاب (۱) ، المزور ، و فی الأحاديث التي قبله لاينهض به إلا العلماء الفحول الكبار ، الجامعون للعلم رواية ودراية وفقها وتاريخا ونقداً وبصيرة ، كالإمام ابن جرير الطبری والحافظ الخطيب البغدادی وشيخ الإسلام ابن تيمية من النقاد الأفذاذ رحمهم الله تعالىٰ . (۲)

میں نے ابھی چند سطر قبل ذکر کیا ہے کہ بسا اوقات بڑے بڑے حضرات سے چوک ہوتی ہے، نیز یہ کہ اگر قواعد پر اصرار وانحصار ہو تو غلطی ہی نہیں، گمراہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کی مثال میں وہ روایات ذکر کی جاسکتی ہیں، جو بعض آیات کی تفسیر کے تحت بعض انبیاء کے اقوال وواقعات میں آئی ہیں جن کو من وعن قبول کرنے کا مطلب ، انبیاءِ کرام علیہم

(۱) ''الکتاب المزور'' سے اشارہ شیخ کے نقل کردہ اس قصے کی طرف ہے کہ ۴۴۷ھ میں یہودیوں نے ایک تحریر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والا نامے کے عنوان سے عباسی حکومت کے وزیر کے سامنے پیش کی، انہوں نے اس کو خطیب بغدادی کے سامنے پیش کیا، یہ ان کا زمانہ تھا، انہوں نے دیکھ کر کہا کہ یہ خط فریب ہے، پھر اس کی وضاحت کی، لمحات من تاریخ السنۃ:۸۹-۸۸، بحوالہ البدایہ وغیرہ

(۲) لمحات:۹۰

الصلوٰۃ والسلام کی عصمت کا یا وحی کی حفاظت کا —— جو عقیدۂ مسلمہ ہے —— اس کو مجروح کرنا؛ بلکہ اس سے ہاتھ دھونا ہے، آپ ان مقامات اور روایات کا جائزہ لیجئے تو ایک موقف متوسعین کا ملے گا، کہ انہوں نے آنکھ بند کر کے روایت کو نقل کر دیا؛ کیوں کہ روایت با سند مل رہی ہے اور آ رہی ہے اور بسا اوقات سند بھی بظاہر ایسی ویسی نہیں ہے۔ (۱)

دوسرا موقف ان حضرات کا ملے گا جنہوں نے سند کے ساتھ مضمون و متن کی نوعیت اور نزاکت پر بھی نظر رکھی، تو سند کو دیکھتے ہوئے وہ روایت کو سرے سے رد بھی نہ کر سکے اور مضمون کو من و عن قبول کرنا ممکن نہ تھا تو توجیہ کی، اگر چہ یہ توجیہ بھی بعض مقامات پر بے جا ہے، دوسرے موقف کو اختیار کرنے والوں میں ابن جریر طبریؒ، اور حافظ ابن حجرؒ جیسے حضرات بھی ہیں جن کا علم ونظر مسلم ہے؛ بلکہ بسا اوقات سندوں و روایتوں کو دیکھ کر ایسے حضرات بھی پہلے ہی موقف والوں کے ساتھ ہیں۔(۲)

ان آیات و روایات کی بھی کسی قدر لمبی فہرست ہے، اس موقع سے سب کا تذکرہ نہیں کیا جا سکتا، بس دو چیزیں ذکر کی جا رہی ہیں، ایک عصمتِ انبیاء سے متعلق اور دوسری وحی کی حفاظت و صیانت سے متعلق۔

سورۂ احزاب آیت: ''وَ إِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ أَنْعَمْتَ عَلَیْهِ'' الآیۃ، اس کی بابت تفسیر جلالین وغیرہ میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے، اس کا مع حاشیہ جلالین میں مطالعہ فرمائیے، اس میں یہ بات بھی ہے کہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا حضرت زید رضی اللہ عنہ سے نکاح کر دینے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ان پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی خاص انداز کی محبت (نعوذ باللہ من ذلک) پیدا ہوئی اور یہ

(۱) اگر چہ ہر موقع سے ایسا نہیں ہوا ہے؛ لیکن کہیں کہیں حافظ ابن حجرؒ نے بھی اعتماد کرتے ہوئے توجیہ کی ہے جیسے کہ دوسرے قصے کے واقعہ میں ہوا ہے، اسی طرح دوسرے حضرات کا بھی معاملہ ہے۔

(۲) تفسیر جلالین میں کئی مواقع ایسے ہیں، مثلاً یوسف:۲۴، حج:۵۲، سورۂ آیت:۲۱-۲۴، سورۂ صٓ:۳۳-۳۴

داعیہ کہ زید طلاق دے دیں تو میں نکاح کر لوں الخ ، اس کو بہت سے ائمۂ تفاسیر و مفسرین نے من و عن نقل کیا ہے ، حتی کہ ابن جریر طبری جیسے صاحبِ نظر محقق نے بھی اس کو بعینہٖ قبول کر لیا ہے؛ حالانکہ یہ عقل و نقل سب کے خلاف ہے، اس سے نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک پر بہت بڑا دھبہ آتا ہے اور عقل کے خلاف تو یوں ہے کہ زینب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بچپن سے اور مکہ مکرمہ سے ان کو دیکھتے چلے آ رہے تھے، پردہ کا حکم تو مدینہ منورہ میں نازل ہوا، پھر یہ بات بھی بے معنی ہے کہ شادی کے بعد اتفاق سے نظر پڑی تو الخ —— نعوذ باللہ من ذلک —— قاضی عیاضؒ، قرطبیؒ اور ابن کثیرؒ وغیرہ سب نے اس کی تردید کی ہے اور ذکر کیا ہے کہ آیت میں اشارہ حضرت زیدؓ کی طرف سے طلاق اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زینبؓ کے نکاح کی طرف ہے، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں :

ذکر ابن جریر و ابن أبی حاتم ههنا آثارا عن بعض السلف رضی الله عنهم أحببنا أن نضرب عنها صفحا ؛ لعدم صحتها فلا نوردها . (۱)

اس بابت حافظ ابن حجر کا موقف بھی تردید کا ہے۔

دوسری بات سورۂ حج آیت:۵۲'' وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَسُوْلٍ وَلَا نَبِیٍّ '' الآیۃ کے تحت آئی ہے اور وہ ہے ''تلک الغرانیق العلی '' والا قصہ، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نجم کے نزول کے بعد یہ سورہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں سنا رہے تھے، جس مجمع میں مشرکین بھی تھے تو شیطان کے تصرف و دخل کی وجہ سے ساتھ ساتھ یہ الفاظ بھی سنے گئے ، جن کو سن کر کفارِ مکہ متاثر و خوش ہوئے الخ ، تفصیل کے لیے جلالین مع حاشیہ

(۱) ابن کثیر:۶/ ۴۲۰،فتح الباری :۸/ ۵۲۳-۵۲۴

ملاحظہ فرمالیجئے ، یہاں بھی بہت سے حضرات نے اس کومن وعن نقل کیا ہے اور بعض نے اس توجیہ کے ساتھ قصے کو قبول کیا ہے کہ تلاوت کے درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی کے وقفے سے شیطان نے فائدہ اٹھا کر یہ کہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں بولا ، یہ نہیں ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کو استعمال کیا ہو، اس قصہ کو بھی طبری وغیرہ نے نقل کیا ہے اور طبری نیز ابوبکر ابن العربی اور حافظ ابن حجر جیسے حضرات نے توجیہ مذکور کے ساتھ قبول کیا ہے، ابن کثیرؒ نے بھی روایتوں پر نقد کے تذکرہ کے ساتھ اس موقع سے ان روایات کو نقل کیا ہے اور اخیر میں مذکورہ توجیہ بھی ذکر کی ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :

کلها سوى طريقي سعيد بن جبير إما ضعيف و إلا منقطع ؛ لكن كثرة الطرق تدل على أن لها أصلاً مع أن لها طريقين أخرين مرسلين رجالهما على شرط الصحيحين أو أحدهما .

اس کے ساتھ حافظ صاحبؒ نے اس قصہ کو کلیتاً رد کرنے والوں کی تردید فرمائی ہے اور یہ بھی فرمایا ہے :

وجميع ذٰلك لايتمشى على القواعد فإن الطرق إذا كثرت وتباينت مخارجها دلّ ذٰلك على أن لها أصلا .

(۱)

اور امام فخر الدین رازی، ابن خزیمہ وبیہقی وغیرہ نے اور فی الجملہ قاضی عیاض نے بھی اس کی کلیتاً تردید کی ہے، یہ کلی اور قطعی تردید کا موقف ان مواقع میں تیسرا موقف ہے ،

(۱) ابن کثیر:۵/ ۴۳۹-۴۴۰ ، فتح الباری:۸/ ۴۳۸-۴۴۰ ، حافظ نے اس کے طرق ومصادر کی کافی تفصیل کی ہے۔

جس کا حاصل واقعہ کی سرے سے تردید اور آیت کی مذکورہ تفصیلات سے بالکل الگ اور پاک وصاف تفسیر ہے، جو آیت کے الفاظ کے بھی مطابق ہو اور دوسری مستند روایات کے بھی، ہمارے لیے مسرت وافتخار کی بات یہ ہے کہ ممتاز علماءِ دیوبندان سارے مواقع میں تیسرے موقف پر ہیں اور تیسری جماعت کے ساتھ ہیں۔(۱)



(۱) بیان القرآن: ۷/ ۷۸-۹/ ۵۳، معارف القرآن:۶/ ۲۷۷-۷/ ۱۵۳-۱۵۴

فن اسماء رجال
تاریخ وتعارف اور اہم کتابیں

اسلام نے دنیا میں جو انقلابات پیدا کیے، ان میں ایک اہم انقلاب یہ ہے کہ اس نے علم اور تعلیم وتعلم کی ایک ہمہ گیر وعالمگیر تحریک چلائی اور یہ کام اس وقت کیا جب کہ دنیا کے بہت تھوڑے حصے علم سے آشنائی اور شغف واشتغال رکھتے تھے اور یہ کام ان لوگوں میں کیا جو اپنے بہت سے کمالات کے باوجود علم کے مسئلے میں تمام اقوامِ عالم سے پیچھے تھے اور بہت پیچھے تھے، حتی کہ ان کا لقب ہی ''امیین'' اور ''قوم امی'' تھا۔

اس لیے علم کی لائن سے مسلمانوں نے عالمِ انسانیت کو روزِ اوّل سے جو کچھ دیا اس میں ایک دو چیزیں ہی ایسی نہیں جو امتِ اسلامیہ کا امتیاز وشعار ہیں؛ بلکہ بعض وجوہ سے مسلمانوں کا جملہ تعلیمی وعلمی کام ایک شعار رہا ہے اور آج بھی ہے۔

مسلمانوں نے قدیم کام کو ہاتھ لگایا تو اس کو اتنا نکھار دیا کہ وہ بالکل جدید ہوگیا اور پھر صدیاں گذر گئیں اور دنیا ترقی کرکے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ؛لیکن ان کے کام سے مستغنی نہ ہوسکی۔

اور جدید کام میں کیا کیا گنایا جائے، علومِ عربیت سارے کے سارے باقاعدہ علم وفن ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی ہی ایجاد ہیں اور علومِ شریعت تو ان کے رہروفکر وخیال کی جولانگاہ رہے ہی ہیں، کتاب ہو یا سنت، دونوں سے متعلق کتنے علوم ہیں جن کا استنباط واستخراج ہوتا رہا اور کام کا سلسلہ بند نہ ہوا۔

اور ان میں بھی حدیث سے متعلق علوم کئی اعتبار سے خصوصیت وامتیاز رکھتے ہیں، ان کی کثرت اتنی ہے کہ بعض علماء نے ان کی تعداد سو سے بھی متجاوز بتائی ہے(۱)؛ کیوں کہ علومِ حدیث کے تحت جو شکلیں اور انواع بھی زیرِ بحث آتی ہیں، ان سب کو مستقل ایک علم وفن شمار کیا جاتا رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہرنوع سے متعلق اتنی تفصیل ہوگئی کہ اس کے لیے مستقل تالیف کی ضرورت محسوس کی گئی اور پھر ایک نہیں کئی کئی کتابیں لکھی گئیں۔

اس کثرت کے ساتھ ان علوم کا تنوع اور ان ایسی ایسی جہتیں ہیں کہ دنیا کی کسی قوم نے کسی بھی علم وفن کے بارے میں اتنی جہتوں کا نہ تو تصور کیا اور نہ ہی آج تک اس رخ پر چلنے کی ان کو توفیق ہوئی۔

پھر جس خاص انداز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک حدیث کو ایک دوسرے سے حاصل کرنے کا سلسلہ چلا آرہا ہے اور سند جو کہ درمیانی کڑی ہے اور حدیث کو دونوں جانب سے جوڑتی ہے، اس سے متعلق علوم اس فن کا ایک بڑا امتیاز ہے اور سند کی کڑیوں یعنی حدیث کے رواۃ ورجال سے متعلق ضروری تفصیلات کا علم اور پھر طرح طرح کے عنوانوں کے تحت ان سے بحث یہ بھی اس کا خصوصی امتیاز رہا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ اسناد اور علمِ رجال اس امت کی خصوصیت وامتیاز ہے —— اور یہ شہرت حق وبجا بھی ہے —— تو حدیث سے متعلق علوم میں صرف اسی علم کو یہ خصوصیت حاصل نہیں؛ بلکہ دوسرے علوم بھی امتیاز رکھتے ہیں، یہ بات الگ ہے کہ علمِ رجال ایک خصوصی امتیازی شان اس لیے رکھتا ہے کہ اس میں وسعت بہت ہے۔

بہرحال اس تمہید کے بعد اصل مدعا پر آتا ہوں کہ اس مجلس میں ''راویانِ حدیث'' سے متعلق علم پر مشتمل کتابوں کا ذکر اور اس سلسلے کی اہم کاوشوں اور کوششوں کا تعارف مقصود ہے۔

(۱) ملاحظہ ہو: علوم الحدیث: ۳۵، تدریب سیوطی وغیرہ

اس علم کو عام طور سے ''علم رجال الحدیث'' یا ''علم الرجال'' اور ''علم اسماء الرجال'' کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے، نیز اس علم کو ''علم معرفۃ الرواۃ''، ''علم تاریخ الرجال'' اور ''علم تراجم الرجال'' بھی کہا جاتا ہے، ان سب کا حاصل ایک ہی ہے۔

اس علم کے تحت خصوصیت سے جو کچھ ضبط وجمع کیا جاتا ہے، وہ ہے ہرراوی کا اصل نام، اس کی کنیت، اس کا لقب، اس کا وطن، جائے پیدائش، جائے

وفات اور جائے قیام وغیرہ، نیز راوی کے آباء واجداد کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ راوی کس مزاج وطبیعت کا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ تقویٰ اور دیانیت کے اعتبار سے کس درجہ ومعیار کا تھا؟ کن کن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا؟ طلبِ علم کے لیے کہاں کہاں کی خاک چھانی؟ کن لوگوں سے اس نے استفادہ کیا؟ کب وفات ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ، غرض یہ ان ہزار ہاہزار راویانِ حدیث کے بارے میں تحقیق وتفتیش کا اتنا زبردست ریکارڈ ہے کہ دنیائے قدیم وجدید کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔(۱)

اس علم کی وسعت کا حال یہ ہے کہ اس کے تحت تقریباً پانچ لاکھ راویانِ حدیث کے ضروری حالات کو ضبط وقلمبند کیا گیا ہے۔(۲)

اور یہ تعداد بھی رجال کی اہم ومعروف کتابوں کی حد تک ہے اور اس زمانے کی حد تک ہے جب تک کہ ان احادیث کو سینہ بہ سینہ اور شفاہاً (رُو در رُو) حاصل کرنے کا سلسلہ رہا؛ اس لیے کہ احادیث جب باقاعدہ مدوّن اور مرتب ومؤلف ہوگئیں تو ان کے حصول میں کتابوں کو ہی واسطہ بنایا جانے لگا اور ان پر اعتماد کیا جانے لگا اور پھر کتابوں کے بعد والے عہد کے رجالِ حدیث کی وہ اہمیت نہیں رہ گئی؛ لیکن اس کے باوجود کام ہوتا رہا، ممتاز ائمۂ فن نے بعد کے ادوار میں اپنے زمانے تک یہ سلسلہ و تذکرہ پہنچانے کی کوششیں کی ہیں

(۱) اسماء الرجال، تقی الدین ندوی:۹

(۲) اسماء الرجال، تقی الدین ندوی:۱، بحوالہ مقدمہ الإصابة، طبع اول

اور فن سے تعلق رکھنے والے ممتاز حضرات کے تذکروں پر برابر کتابیں لکھی جاتی رہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

یہ ضرور ہے کہ آخری عہد میں رجالِ حدیث کے حالات اس انداز میں جمع نہیں کیے گئے جو انداز پہلے رہا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ رجالِ حدیث کے خصوصی تذکروں کے بجائے زمان ومکان کی بنیاد پر عمومی تذکروں میں یہ کتابیں ہیں، دوسری یہ کہ حالات میں بھی ان فنی اور اصطلاحی چیزوں میں انحصار نہیں رہ گیا ، جو ابتدائی عہد کی کتابوں کا امتیاز ہے۔

اس لیے علماءِ اسلام کے جو تذکرے دنیا کے مختلف ملکوں اور زبانوں میں تیار ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، وہ بھی فی الجملہ اسی سلسلے کڑی ہیں، مثلاً ہندوستان کے علماء سے متعلق مولانا سید عبدالحئ حسنی کی معروف کتاب "نزهة الخواطر وبهجة السامع والنواظر" جو اس وقت "الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام" کے نام سے شائع ہو رہی ہے، اسی طرح قاضی اطہر مبارکپوریؒ کی "رجال الہند والسند" وغیرہ اور تذکرہ علماءِ کذا و کذا۔

ان کے علاوہ خال خال خصوصی کوششیں بھی مل جائیں گی، خواہ ضمناً خواہ مستقلاً، ضمناً تو یوں کہ بعض شروح وغیرہ کے مؤلفین نے اپنے اساتذۂ حدیث اور سلسلۂ اسناد اور اس کے رجال، نیز ان کے ضروری احوال کا تذکرہ کیا ہے۔

اور مستقلاً یوں کہ ہر زمانے میں ممتاز محدثین نے خود، یا ان کے تلامذہ نے اپنے سلسلۂ سند کو جمع کیا ہے، تو اس میں اس سلسلہ کے رجال کے ضروری حالات اہتمام سے ذکر کیے گئے ہیں، مثلاً ولی اللہی سلسلہ سے متعلق شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی کی "اليانع الجني في أسانيد عبد الغني" اور پھر درمیانی کڑیوں کو چھوڑ کر اس سلسلے کی ایک اہم کاوش وکوشش پر آجایئے، یعنی مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری مدظلہ العالی کی "العناقيد الغالية في الأسانيد العالية" جو جملہ علماءِ دیوبند کی تقریباً تمام اسانید کے ذکر پر اور تمام ممتاز رجالِ حدیث واساتذۂ حدیث کے ضروری احوال پر مشتمل ہے۔

مصر میں کچھ دنوں پہلے ایک صاحب رجال کے موضوع پر بڑے وسیع پیمانے پر کام کر رہے تھے، جو اصلاً ایک جامع انڈکس واشاریہ تھا اور اس میں عہدِ صحابہ سے لے کر اب تک کے جملہ علماءِ اسلام کے تذکروں کی ایک جامع ومکمل فہرست تھی اور اس کے مراجع میں اس انداز کی جملہ کتب شامل تھیں، بشرطیکہ وہ عربی میں ہوں، احقر کو مسودہ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اس کاوش کا نام "موسوعة الرجال" تجویز کیا گیا تھا "موسوعة أطراف الحديث" کے عنوان سے متونِ حدیث کی جو سب سے بڑی فہرست آج ہمارے پاس ہے، جس جگہ یہ کام ہوا اسی جگہ رجال والا کام بھی ہوتا رہا، دونوں کاموں کو انجام دینے والے دو الگ الگ افراد تھے، افسوس کہ اب تک اس موسوعہ کی اشاعت نہیں ہوسکی ورنہ اس بابت ایک نہایت ہی مفید وعظیم اور ہمہ گیر چیز ہمارے پاس ہوتی۔(۱)

اور اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ رجالِ حدیث کے خصوصی تذکروں کا سلسلہ جب سے بند ہوا ہے، اس کے بعد کے رجالِ حدیث کے ذکر وتذکرہ سے متعلق خصوصی کام کیا جائے، خواہ وہ عمومی ہو عالم اسلام یا جملہ عالم کی سطح پر، یا یہ کہ علاقائی وملکی پیمانے پر ہو، مثلاً محدثین ہند کا ایک خصوصی تذکرہ مرتب کیا جائے

اور بہتر ہے کہ وہ اسی نہج وانداز پر ہو جو کتبِ رجال کا عام انداز ہے۔

(۱) ’’موسوعة أطراف الحديث‘‘ اور ’’موسوعة الرجال‘‘ ان دونوں موسوعات پر کام قاہرہ کے ایک مشہور مکتبہ ’’مکتبۃ المصطفیٰ‘‘ کے مرکز میں انجام پایا، اطراف کا کام تو محمد السعید زغلول نے انجام دیا ہے اور رجال پر خود صاحبِ مکتبہ شیخ حامد ابراہیم صاحب کی توجہ تھی، مکتبۃ المصطفیٰ قاہرہ وجیزہ کا ایک ایسا مکتبہ رہا ہے، جس کا نفع متعدی ہوکر اطرافِ عالم تک پہنچا، ’’موسوعة أطراف الحديث‘‘ کے مقدمہ میں اس موسوعۃ الرجال کا تفصیل سے ذکر ہے اور اس تفصیلی تعارف میں دو اور مفید فہرستیں شامل ہیں، ایک تو ان کتابوں کی جن سے استفادہ کیا گیا ہے، جن میں ’’نزهة الخواطر‘‘، ’’رجال الهند والسند‘‘ اور ’’الفوائد البهية‘‘ بھی شامل ہیں، یہ کل ۱۲۶ کتابیں ہیں، دوسری فہرست تراجم محدثین کی ہے، جو ۶۴ تا ۷۰ تک ہے۔

بہر حال ان بعد کے تذکروں کو اگر شمار کیا جائے جس کا اوپر ذکر آیا، یعنی علماءِ امت کے عام تذکرے، تو رجالِ حدیث کی مقدار اس سے کہیں زیادہ ہو جائے گی، جو تاریخ رجال کے لیے معروف ہے۔

اب آیئے رجال کی کتابوں کی طرف، تو پہلے ذکر آچکا ہے کہ رجال کی معروف ومعتمد تاریخ میں پانچ لاکھ راویوں کے حالات آئے ہیں اور وہ حالات جس قسم کے ہوتے ہیں، ان کی بھی تفصیل آچکی ہے اور مذکورہ تفصیل پر مشتمل اتنی بڑی تعداد کے حالات اگر ایک ہی کتاب میں جمع کیے جائیں تو بہت بڑا ذخیرہ ہوگا، ایک کتاب میں کسی طرح بھی اس کو سمونا اور سمیٹنا بڑا اہم مسئلہ ہے، اس لیے یہ کام اس طرح تو ہوا نہیں کہ بس ایک کتاب میں سب کو جمع کر دیا جاتا؛ بلکہ کام کرنے والوں نے اپنے اپنے ذوق ومزاج اور انتخاب، نیز احساسِ ضرورت کے مطابق اپنی معلومات کو جمع کیا ہے، جو مختصر سے مختصر بھی ہے اور نہایت مفصل بھی اور بسا اوقات اتنا مبسوط کہ مصنف نے روزِ اوّل سے لے کر اپنے عہد تک کے جملہ رواۃ ورجال کو اپنی کتاب میں لے لیا ہے۔

یہ سارا کام ایک ہی نہج اور ایک ہی عنوان سے نہیں ہوا؛ بلکہ عناوین بھی مختلف اور انداز بھی مختلف، کسی نے زمانے وعلاقے کی بنیاد پر کام کیا ہے تو کسی نے طبقات کی بنیاد پر، کسی نے ایک محدث یا چند محدثین کو لیا ہے تو کسی نے ایک کتاب یا چند کتابوں کو، بعض نے انساب وقبائل کی بنیاد پر کام کیا ہے تو بعض نے خاص صفات وامتیازات کو سامنے رکھا ہے، کسی نے رواۃ کے ضعف وقوت کو اور کسی نے جرح وتعدیل کو بنیاد بنایا ہے۔

یہ بھی ہوا ہے کہ رواۃ کے درمیان کوئی خاص نسبت ومناسبت کے تحت کام کیا گیا، حتی کہ رجالِ حدیث کے تذکرہ میں جن حالات کا بیان ضروری سمجھا گیا ہے، ان میں سے مختلف چیزوں کو مدنظر رکھ کر الگ الگ کام ہوا ہے، مثلاً رواۃ کی پیدائش یا وفات یا صرف ضعف یا صرف ثقاہت۔

ان مختلف بنیادوں سے اگر آپ واقف ہونا چاہیں تو علوم الحدیث و مصطلح الحدیث کی جامع کتابوں کی فہارس ومباحث میں آپ کو یہ بنیادیں مل جائیں گی، نیز ’’**تيسير مصطلح الحديث**‘‘ میں ’’**علم معرفة الرواة**‘‘ کے تحت ۲۱ بنیادیں ذکر کی گئی ہیں، جب کہ اس میں کچھ چیزوں کا تذکرہ ’’لطائف الاسناد‘‘ کے عنوان کے تحت آیا ہے، ان کو ملا کر کل تعداد ۲۸ ہوتی ہے۔

’’**منهج النقد**‘‘ میں ان بنیادوں کو یوں دو حصوں میں کیا گیا ہے کہ ایک ہے ’’**علوم الرواة التاريخية**‘‘ اور دوسرا ہے ’’**علوم أسماء الرواة**‘‘ اوّل کے تحت دس اور دوم کے تحت ۱۳ کا تذکرہ ہے اور ہر بنیاد ایسی ہے کہ اس کی طرف نسبت وعنوان کے ساتھ کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کتابوں سے بہ سہولت واقفیت کے لیے **تيسير مصطلح الحديث** اور **منهج النقد** کی مراجعت کی جائے۔(۱)

بعض معاصر ممتاز علماء نے ان کتابوں کے تذکرہ وتعارف میں دو مرکزی عنوانات کو اختیار کیا ہے، ایک ’’علم تاریخ الرجال‘‘ اور دوسرا ’’علم الجرح والتعدیل‘‘(۲) اس لیے کہ بعض حضرات نے کتبِ رجال کا جو اصل مقصد ہے اس کو نظر میں رکھتے ہوئے راویوں کے حق میں جرح وتعدیل کو بنیاد بنایا ہے اور ان

مؤلفات کے نام وعنوان میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے، یا اس کے مناسب کوئی عنوان، جیسے علل یا ثقات وضعفاء وغیرہ۔

اور بعض نے کتبِ تواریخ کا جو انداز و اُسلوب عموماً ہوا کرتا ہے، اس کو محور بنا کر یہ کام کیا ہے اور پھر اسی کے مناسب عنوان بھی رکھا ہے، مثلاً تاریخ یا انساب یا طبقات وغیرہ، مآل بہرحال سب کتابوں اور کاوشوں کا ایک ہے، اب رہ گئی یہ بات کہ اس بابت خصوصی و مستقل کتابوں کی تالیف کا سلسلہ کب سے اور کس سے شروع ہوا ہے ؟ تو یہاں بھی معاملہ علوم

(۱) ملاحظہ ہو: تیسیر مصطلح الحدیث ، باب چہارم از: ۱۷۹ تا آخر ومنهج النقد: ۴۳-۴۸

(۲) علم رجال الحدیث از: تقی الدین ندوی

الحدیث کی تدوین وتالیف جیسا ہے کہ یہ کام بھی متون کے جمع وتالیف کے زمانے کے ساتھ ہوتا رہا ہے اور ترقی پاتا رہا، البتہ علوم الحدیث سے متعلق جامع کتب کا سلسلہ کچھ تاخیر سے شروع ہونا معروف ہے، جیسا کہ گفتگو آچکی ہے؛ لیکن رجالِ حدیث کے احوال سے متعلق مستقل اور جامع کتب کی تالیف میں اتنی تاخیر نہیں ہوئی ہے، یہ کام تو متون کے ساتھ ہی ساتھ تقریباً ہوتا رہا، آگے اس کی تفصیل آنے والی ہے۔

ویسے باقاعدہ تالیف میں اوّلیت تو مشہور ومعروف امامِ جرح وتعدیل یحییٰ بن سعید قطان (م:۱۸۹ھ) کے لئے ذکر کی جاتی ہے، جیسا کہ امام ذہبیؒ نے ''میزان الاعتدال'' میں ذکر کیا ہے (۱)؛ لیکن ان کی کوئی کتاب معرضِ وجود میں نہیں ہے، ان کے بعد پھر تیسری صدی ہجری کے ربعِ اوّل ونصفِ اوّل کے آس پاس وفات پانے والے کئی حضرات کی تالیفات ہیں۔

گذشتہ سطور میں یہ بات آئی ہے کہ رجال کی بابت کام بہت سی بنیادوں پر ہوا ہے، تو اس سلسلہ کی کتابوں کی فہرست لامحالہ بہت طویل ہے؛ خصوصی مناسبتوں کو چھوڑیئے عمومی عناوین والی کتابیں بھی بہت ہیں۔

مثلاً جرح وتعدیل کے عنوان سے امام احمد بن حنبلؒ (م:۲۴۱ھ) ابن حبان (م:۳۵۴ھ) ابن ابی حاتم رازیؒ (م:۳۲۷ھ) کی کتابیں ہیں، ان میں ابن ابی حاتم کی کتاب طبع شدہ ہے، اوّلین اشاعت ہندوستان سے ہوئی ہے، جیسے کہ جمال الدین قاسمی (م:۱۳۳۲ھ) کی بھی ایک کتاب اسی نام سے شائع ہوئی ہے، ابن ابی حاتمؒ کی کتاب نہایت اہم ہے اور مبسوط بھی، جو ۹ رجلدوں میں شائع ہوئی ہے اور ایک جلد صرف مقدمہ وتمہید پر مشتمل ہے، جس میں فن کی اہمیت اور ائمۂ فن کے حالات ذکر کیے گئے ہیں۔

(۱) میزان الاعتدال: ۱

''علل'' کے عنوان سے حسبِ ذیل حضرات کی کتب ہیں :

(۱) یحییٰ بن معینؒ (م:۲۳۳ھ)

(۲) علی بن المدینیؒ (م:۲۳۴ھ)

(۳) امام احمدؒ، امام بخاریؒ (۱) (م:۲۵۶ھ)

(۴) ابن ابی حاتمؒ، یعقوب بن شیبہ (م:۲۶۲ھ)

(۵) امام ترمذیؒ (م:۲۷۹ھ)

(۶) ابوزرعہ دمشقیؒ (م:۲۸۰ھ)

(۷) ابوبکر بزارؒ (م:۲۹۲ھ)

(۸) ابویحییٰ الساجیؒ (م:۳۰۷ھ)

(۹) ابوعلی ماسرجسیؒ (م:۳۶۵ھ)

(۱۰) ابواحمد الحاکمؒ (م:۳۷۸ھ)

(۱۱) ابن عدیؒ (م:۳۶۵ھ)

(۱۲) ابوالحسین الحجاجیؒ (م:۳۶۸ھ)

(۱۳) دارقطنی (م:۳۸۵ھ)

(۱۴) حاکم ابوعبداللہ (م:۴۰۵ھ)

(۱۵) خلال (م:۵۹۷ھ)

(۱۶) ابن الجوزی (م:۵۹۷ھ)

(۱۷) حافظ ابن حجرؒ (م:۸۵۳ھ)

ان میں علی بن مدینی اور امام ترمذیؒ کی متعدد کتب ہیں اور ماسرجسی کی کتاب بہت

(۱) امام بخاریؒ کی علل کا تذکرہ حافظ ابن حجرؒ نے کیا ہے، تحقیق ابن رجب:۳۳

ضخیم ہے، جب کہ دارقطنی کی کتاب کو عام طور سے سراہا گیا ہے(۱)، ان میں امام ترمذیؒ کی علل صغیر اور امام احمد و دارقطنی اور ابن المدینی کی کتب طبع شدہ ہیں، نیز ابن الجوزیؒ کی کتاب بھی ''العلل المتناهية'' کے نام سے طبع ہوچکی ہے اور ابن ابی حاتم کی العلل بھی شائع ہوچکی ہے۔

تاریخ کے عنوان سے بہت سی کتابیں ہیں، مثلاً یحییٰ بن معین کی ''تاریخ الرواۃ ومعرفۃ الرواۃ'' امام بخاریؒ کی ''التاریخ الکبیر'' اور ''التاریخ الصغیر'' اور ''التاریخ الأوسط'' ابن حبانؒ کی ''مشاهیر العلماء والأمصار'' ابن خیثمہؒ (م:۲۷۹ھ) کی تاریخ اور حافظ ذہبی کی ''تاریخ الإسلام وطبقات المشاهیر والأعلام'' نیز ''سیر أعلام النبلاء'' اور یہ سب کی سب مطبوع ہیں۔

''انساب'' کے عنوان وبنیاد سے سمعانی ابوالمظفرؒ (م:۵۶۲ھ) کی ''الأنساب'' اور علی بن محمد جزریؒ (م:۶۳۵ھ) کی ''اللباب'' نیز ابن الاثیر (م:۶۰۶ھ) کی ''اللباب فی تهذیب الأنساب'' یہ کتب بھی مطبوع ہیں اور سمعانیؒ کی ''الأنساب'' سب سے پہلے ہندوستان ہی سے شائع ہوئی ہے۔

ولادت ووفات کو موضوع بنا کر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں عبدالغنی بغدادیؒ (م:۳۵۱ھ) اور ابن مندہؒ (م:۳۹۵ھ) کی ''الوفیات'' محمد بن عبداللہ دمشقیؒ (۳۷۹ھ) کی ''تاریخ موالد العلماء و وفیاتهم'' صلاح الدین صفدیؒ کی ''الوافی بالوفیات'' نیز منذری (م:۶۵۶ھ) کی ''التکملة لوفیات النقله'' قاسم بن محمد دمشقیؒ (م:۷۰۳ھ) کی ''وفیات النقله'' جس پر ابن حجر کا ذیل بھی ہے اور سب سے معروف ابن خلکان (م:۶۸۱ھ) کی ''وفیات الاعیان'' اور اس کے متعلقات ہیں۔

(۱) ان میں بہت سی کتب کا تذکرہ ابن رجب کی شرح ''عللِ ترمذی'' کے مقدمہ تحقیق میں آیا ہے اور کتابوں کا تعارف بھی ہے۔

علاقائی رواۃ کے احوال میں ابوعبداللہ حاکمؒ (م:۴۰۵ھ) کی تاریخ نیشاپور، خطیب بغدادی (م:۴۶۳ھ) کی ''تاریخ بغداد'' اور ابن عساکر (م:۵۸۱ھ) کی ''تاریخ دمشق'' معروف ہیں اور سب طبع شدہ ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سی علاقائی کتب ہیں اور انہیں میں ''نزهة الخواطر'' وغیرہ کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔

طبقات کے عنوان سے جو کتابیں ہیں، ان میں ابن سعدؒ (م:۲۲۳ھ) کی ''الطبقات الکبریٰ'' اور خلیفہ بن خیاط (م:۲۴۰ھ) کی ''طبقات الرواۃ'' اور ابونعیم اصفہانی (م:۴۳۰ھ) کی ''طبقات المحدثین والرواۃ'' معروف ہیں، ابن سعد کی طبقات سب سے زیادہ معروف اور مستند اور مقبول ومتداول رہی ہے، یہ مفصل بھی ہے، طبع شدہ ہے اور فن کی اوّلین کتب میں سے ہے، ''طبقات'' کے عنوان سے بہت سی کتابیں کسی خاص وصف وامتیاز کی بنیاد پر بھی لکھی گئی ہیں، جیسے ''طبقات الشافعیة، طبقات الحنابلة اور طبقات المفسرین'' وغیرہ۔

معروف متونِ حدیث سے متعلق مخصوص کتابوں کی فہرست بھی کافی لمبی ہے، مثلاً صحاحِ ستہ کے رواۃ کے حالات میں عبدالغنی مقدسیؒ (م:۶۰۰ھ) کی ''الکمال فی معرفة أسماء الرجال ''اور جمال الدین مزی(م:۷۴۲ھ) نیز ابوالعباس عسکری دمشقیؒ (م:۷۵۰ھ) کی ''تہذیب الکمال'' علاء الدین مغلطائی حنفی(م:۸۶۲ھ) اور ابن الملقن الشافعیؒ (م:۸۰۴ھ) کی ''اکمال تهذیب الکمال ''امام ذہبی(م:۷۴۸ھ) کی ''تذہیب تہذیب الکمال'' اور ''الکاشف فی معرفة أسماء الرجال'' ذہبی کی تذہیب کا خلاصہ ''خلاصة التذهیب ''مؤلفہ صفی الدین خزرجی (م:۹۲۳ھ) اور حافظ برہان الدین حلبیؒ معروف بسبط العجمیؒ (م:۸۴۱ھ) کی ''نہایۃ السول فی رواۃ الستۃ الأصول'' جس کو انتہائی نافع ومفید بتایا جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ بہت جامع کتاب ہے۔(۱)

(۱) مقدمہ خلاصۃ التذہیب از شیخ عبدالفتاح

نیز ابن حمزہ حسینی دمشقیؒ (م: ۷۶۵ھ) کی ''التذكرة برجال العشرة ''(صحاحِ ستہ کے ساتھ مسندِ احمد، مسندِ شافعی، مسندِ ابی حنیفہ وموطا مالک کے رواۃ پر) اور حافظ ابن حجرؒ کی ''تعجیل المنفعة بزوائد رجال الأئمة الأربعة ''(مذکورہ چاروں کتب کے ان رواۃ کے ذکر میں ہے، جو صحاحِ ستہ کے روات میں سے نہیں ہیں) ابن حمزہؒ کی ''التذکرہ'' کو ''مختصر تہذیب الکمال'' بھی کہتے ہیں، تہذیب الکمال کے اختصار کا کام ابوالوفاء حنبلی بعلبکی (م:۷۸۶ھ) ابوبکر حنبلی (م:۸۰۴ھ) اور ابوبکر ابن قاضی شہبہؒ (م:۸۵۱ھ) نے بھی کیا ہے اور ان تہذیبات اور اختصار وتذییلات کا تتمہ ابوالفضل محمد بن محمد شافعی (م:۸۷۱ھ) کی کتاب ''التقریب '' اور'' تكمیل التهذیب بالتذهیب'' ہے، جس میں مزی کی تہذیب کے ساتھ ذہبی کی تذہیب اور حافظ کی تہذیب التہذیب کی زیادات کو بھی لے لیا گیا ہے۔(۱)

اہم کتابوں کے روات پر مستقلاً بھی کتابیں ہیں، مثلاً ابونصر کلاباذیؒ (م:۳۹۸ھ) کی ''رجال الصحیحین ''ابن حمزہ حسینی کی ''الإکمال بمن فی مسند أحمد من الرجال ''سیوطیؒ کی ''إسعاف المبطا برجال المؤطا'' وغیرہ۔

ان میں سے اکثر کتابیں مطبوع ہیں، بالخصوص ''تہذیب التہذیب''، ''تقریب'' اور ''خلاصۃ'' جو بہت عام ہیں، نیز ''تہذیب الکمال'' مزی کی بھی طبع ہو چکی ہیں۔

رواۃ کے ضعف وثقاہت کو جن کتابوں میں موضوع بنایا گیا ہے، وہ بھی بہت ہیں اور اُصولی طور پر تین قسم کی ہیں۔

۱ — ضعیف وثقہ دونوں قسم کے راویوں سے متعلق، جیسے وہ تمام کتب جو جرح وتعدیل کے عنوان سے ہیں، نیز ابن کثیرؒ (م:۷۷۴ھ) کی کتاب ''التکمیل فی معرفة

(۱) الکمال کے متعلقات کے لیے ملاحظہ ہو: خلاصة التذهیب پر شیخ عبدالفتاح کا مقدمہ، نیز مولانا تقی الدین ندوی کی علم رجال الحدیث

الثقات والضعفاء والمجاهیل ''، جس میں انہوں نے مزی کی ''تہذیب الکمال'' اور ذہبی کی ''میزان الإعتدال ''دونوں کو جمع کر دیا ہے۔

۲ — ثقہ راویوں سے متعلق مخصوص کتابوں میں معروف ہیں، جیسے احمد بن عبداللہ العجلیؒ (م:۲۶۳ھ) اور ابن حبانؒ (م:۳۵۴ھ) کی ''الثقات'' اور ابن شاہین (م:۳۸۵ھ) کی ''تاریخ أسماء الثقات'' قاسم بن قطلو بغا (م:۸۷۹ھ) کی ''کتاب الثقات'' اور حافظ ذہبیؒ کی ''تذکرۃ الحفاظ'' جو ''طبقات الحفاظ'' بھی کہلاتی ہے اور اس کے متعلقات، اور تقریباً یہ سب ہی مطبوع ہیں اور ابن حبان کی ''الثقات'' بڑی مفصل اور کئی جلدوں میں ہے اور ''تذكرة الحفاظ مع متعلقات '' کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر امام ذہبی تک اور اس کے بعد کے ذیول میں سیوطی کے عہد تک کے حفاظِ حدیث کا اس میں تذکرہ ہے۔

۳ — ضعیف راویوں کی بابت کتابیں زیادہ ہیں، مثلاً امام بخاریؒ کی ''کتاب الضعفاء الکبیر'' اور ''کتاب الضعفاء الصغیر ''محمد بن عبداللہ برقیؒ (م:۲۴۹ھ) کی ''الضعفاء''، امام نسائیؒ (م:۳۰۳ھ) کی ''الضعفاء والمتروکون ''، ابن حبان کی ''کتاب المجروحین ''، ابن عدی جرجانیؒ (م:۳۱۵ھ)

کی ''الکامل فی ضعفاء الرجال''، عقیلیؒ (م:۳۲۲ھ) کی ''الضعفاء'' دارقطنیؒ (م:۳۸۵ھ) کی ''الضعفاء والمتروکون''، حاکم ابوعبداللہ (م:۴۰۴ھ) کی ''المدخل''، ابن الجوزیؒ (م:۵۹۷ھ) کی ''أسماء الضعفاء والوضاعین''، حافظ ذہبیؒ کی ''میزان الاعتدال'' اور حافظ ابن حجرؒ کی ''لسان المیزان''، نیز ذہبی کی کتابوں میں ''المغنی فی الضعفاء'' اور ''کتاب الضعفاء'' بھی ہیں، ان میں سے بھی اکثر مطبوع ہیں اور بالخصوص ''میزان الاعتدال'' اور ''لسان المیزان'' بہت مقبول ومتداول ہیں اور یہ دونوں کتابیں اوّلین مرحلے میں ہند سے شائع ہوئی ہیں تاہم ان میں معروف ائمہ حدیث وفقہ کا تذکرہ نہیں ہے۔

رجال کی عام کتب میں خواہ وہ کسی عنوان سے ہوں (بس ضعفاء وغیرہ سے متعلق نہ ہوں) صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعینؒ کا بھی تذکرہ آتا ہے؛ لیکن محدثین نے طبقات کے اہتمام میں نیز صحابہ وتابعین کے علوِشان کے پیش نظر، ان کے تذکروں میں مستقل اور مفصل وگرانقدر کتابیں لکھی ہیں، مثلاً صحابہؓ کے تذکرہ کی معروف کتابوں میں ابن حبان کی ''کتاب الصحابۃ''، ابوموسیٰ مدینیؒ (م:۲۳۴ھ) کی ''معرفۃ من نزل من الصحابۃ بسائر البلدان''، ابن عبدالبر مالکیؒ (م:۴۶۳ھ) کی ''الإستیعاب''، ابن الاثیرؒ (م:۶۳۰ھ) کی ''اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ'' اور حافظ ابن حجر کی ''الإصابۃ فی تمییز الصحابۃ'' وغیرہ ہیں، مؤخر الذکر تینوں کتب مطبوع ومتداول ہیں اور ابن حبان کی ''کتاب الصحابۃ'' اس وقت ''تاریخ الصحابۃ'' کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔

تابعین سے متعلق اہم کتابوں میں امام مسلمؒ کی ''طبقات التابعین''، ابن حبان کی ''کتاب التابعین''، ابن فطیس اندلسیؒ (۴۰۲ھ) کی ''معرفۃ التابعین'' اور دارقطنیؒ کی ''ذکر أسماء التابعین'' شائع ہو چکی ہیں۔

تبع تابعین کے تذکرہ میں ابن حبانؒ کی ''تباع التابعین'' اور ''أتباع التابعین'' معروف ہیں، دونوں کافی ضخیم بتائی جاتی ہیں۔

مخضرمین (جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا؛ لیکن بحالت اسلام ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا شرف نہ حاصل ہو سکا) اس سے متعلق سبط العجمیؒ (م:۸۴۱ھ) کی کتاب ''تذکرۃ الطالب المعلم بمن یقال إنہ مخضرم'' ہے اور یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

یہ اس سلسلے کی کتابوں کا ایک اجمالی تذکرہ تھا اور وہ بھی اہم ومعروف کتابوں کا، جہاں تک سوال ہے ان کے تفصیلی تعارف کا اور جملہ مطبوع وغیر مطبوع کی تحقیق کا تو یہ بہت لمبا کام ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ مذکورہ کتابوں میں سے اگرچہ بہت سی کتابیں نایاب ہو گئیں اور بہت سی اب بھی طباعت کے مرحلے کو نہیں پہنچ سکیں، پھر بھی رفتہ رفتہ اب ایک بڑی تعداد شائع ہو چکی ہے اور جو کتابیں کہیں بھی موجود ہیں، بتدریج ان کی اشاعت کا کام ہو رہا ہے؛ اس لیے کہ اب اس سلسلے کے وسائل بہت ہو گئے ہیں۔

اس موقع سے تفصیلی تعارف میں چند اہم اور مفید وگرانقدر مطبوع ومتداول کتب کا تذکرہ چند سطروں میں کیا جا رہا ہے :

ان کتابوں میں سرفہرست حافظ ابن حجرؒ کی دو کتابیں ہیں: ''تہذیب التہذیب'' اور ''تقریب التہذیب''، یہ دونوں کتابیں صحاحِ ستہ اور اصحابِ صحاحِ ستہ کے رواۃ سے متعلق ہیں، اوّل مبسوط تذکرہ ہے اور اس کا ذکر آچکا ہے کہ مقدسی کی الکمال پر جو مزی نے تہذیب کا کام کیا ہے، اس کتاب میں حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تلخیص اور تہذیب، یعنی حذف واضافہ کا کام کیا ہے، اس کی اوّلین اشاعت حیدرآباد سے ہوئی اور اس کا عکس چلتا رہا اور چل رہا ہے، لیکن اب اس کا ایک نیا ایڈیشن بھی آ گیا ہے اور ہر دو ایڈیشن کے ساتھ رجال کی مکمل فہرست بھی شائع ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے بڑی سہولت ہوتی ہے اور ''تقریب التہذیب'' اسی کا خلاصہ ہے، جو بقدرِ ضرورت اور حاصل مقصد معلومات پر مشتمل ہے، یہ بھی اوّلاً ہندوستان سے شائع ہوئی اور اب کئی ایڈیشن دستیاب ہیں، کچھ عرصہ پہلے ایک جلد میں اس کی نہایت خوبصورت اشاعت ہوئی ہے، صحاحِ ستہ کے رجال یا مطلق رجالِ حدیث کی تحقیق میں آپ کو عموماً ان دونوں کتابوں کا تذکرہ وحوالہ ضرور ملے گا

۔

تقریب کی طرف مراجعت میں بسا اوقات اختصار کے ساتھ کچھ مزید وضاحت وصراحت کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، یہ ضرورت خزرجی کی ''خلاصۃ التہذیب'' سے پوری ہوتی ہے، جو علامہ ذہبی کی ''تذھیب التھذیب'' —— جس کا تذکرہ آچکا ہے —— کا خلاصہ ہے؛ لیکن صرف خلاصہ نہیں بلکہ اس پر اضافہ بھی ہے، جس سے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے، اس کے بھی کئی ایڈیشن دستیاب ہیں اور متعدد اہل علم نے اس پر تحقیق وتعلیق کا کام کیا ہے۔

بہرحال یہ دونوں کتابیں یعنی ''تقریب التہذیب'' اور ''خلاصۃ التذھیب'' مختصر وقت اور کم الفاظ میں ضروری معلومات فراہم کر دیتی ہیں اور یوں ان دونوں کتابوں کی افادیت ہم طلباء کے لیے بہت زیادہ ہے اور اہل نظر نے ان کے امتیازات اور خصوصی افادات کو بڑے اہتمام سے ذکر کیا ہے۔(۱)

ثقہ راویوں کے سلسلے میں ابن حبان کی ''ثقات'' اور ذہبی کی '' تذکرۃ الحفاظ'' اپنے ملحقات واضافات کے ساتھ اہم ہے اور کتاب اپنے جملہ متعلقات کے ساتھ شائع ہوچکی ہے اور متداول ہے، جیسا کہ ''ثقات ابن حبان'' بھی اب عام ہے اور '' تذکرۃ الحفاظ'' (مؤلفہ ذہبی) کی اوّلین اشاعت بھی ہندوستان کے حصے میں آئی ہے۔

ضعیف راویوں کی بابت حافظ ذہبی کی ''میزان الاعتدال'' اور حافظ ابن حجر کی ''لسان المیزان ''معروف اور متداول ہیں اور یہ دونوں طبع شدہ ہیں، '' لسان المیزان '' بھی اوّلاً دائرۃ المعارف العثمانیہ سے ہی شائع ہوئی ہے، ''میزان'' دراصل ابن عدی کی ''الکامل'' کا خلاصہ ہے؛ اگرچہ کچھ اضافہ اور مزید تحقیقات بھی ہیں، ''میزان'' میں ایک اہم خامی بہت سے رجال کے حق میں ابن عدی کی غیر معتدل رائے کو من وعن نقل کردینا ہے اور ''لسان المیزان '' د راصل میزان کی تہذیب ہے، اس میں حافظ ابن حجر نے ائمۂ ستہ کے بہت سے رواۃ کو، نیز ''تہذیب الکمال'' کے رواۃ کو حذف کردیا ہے اور اس کے بعد کافی اضافہ کے ساتھ کتاب کو مرتب کیا ہے؛ چنانچہ ''میزان الاعتدال'' میں تو کل: ۱۰۹۷ تراجم ہیں اور ''لسان المیزان'' میں ۱۴۳۴۳ ہیں۔

(۱) کتابوں کے تعارف میں مولانا تقی الدین صاحب کی کتاب ''أسماء الرجال ''اور''علم رجال الحدیث'' سے کافی استفادہ کیا گیا ہے اور دوسری بھی کتابیں سامنے رہی ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ امام بخاریؒ کی ''التاریخ الکبیر'' اور امام ذہبیؒ کی '' تاریخ المشاہیر'' یہ دونوں کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں؛ اس لیے کہ ان دونوں کتابوں کا دائرۂ کار اور تحقیق بہت وسیع ہے، تاریخ بخاری افراد کی تعداد کے اعتبار سے اور ذہبی کی تاریخ زمانہ کے پھیلاؤ کے اعتبار سے ہے، امام بخاری نے اپنی اس تاریخ میں تقریباً چالیس ہزار افراد کے حالات قلمبند کیے ہیں اور یہ کام انہوں نے اوائل عمر میں بہ عمر ۱۸ سال مدینہ منورہ میں رہ کر کیا ہے، اس کی بھی اوّلین اشاعت دائرۃ المعارف العثمانیہ سے آٹھ جلدوں میں ہوئی۔

ذہبی کی تاریخ پہلی صدی ہجری کے اوائل سے ان کے زمانے تک کا احاطہ کیے ہوئی ہے، ان کی وفات ۷۴۸ھ میں ہے، اصل کتاب جو کہ ۳۵ جلدوں میں بتائی جاتی ہے، اس کی تو چند ہی جلدیں شائع ہوئی ہیں؛ البتہ اس کا خلاصہ جو خود امام ذہبی نے ''سیر اعلام النبلاء'' کے نام سے لکھا ہے، وہ اب مکمل شائع ہوچکا ہے اور وہ خود تقریباً بیس جلدوں میں ہے۔(۱)

اس سمع خراشی کو احقر چند تعقبات وگذارشات پر ختم کرتا ہے، تعقبات یہ ہیں جو دراصل تنبیہات ہیں کہ رجال کی بعض معروف اور متداول ومستند کتب میں کچھ پہلو لائق توجہ ہیں :

۱- حافظ ذہبی کی میزان الاعتدال کا ضابطہ یہ ہے کہ اس میں ائمۂ متبوعین ومقبولین کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، اگرچہ ان پر بھی نقد وجرح کتابوں میں موجود ہیں، مگر معروف ہے کہ ہر نقد وجرح معتبر نہیں ہے، اس کے باوجود میزان کے بعض نسخوں میں امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ ملتا ہے، جس کو بعض شر پسند بڑی اہمیت سے ذکر کرتے ہیں ، صحیح یہ ہے کہ اس کتاب میں امام صاحب کا ترجمہ و تذکرہ الحاقی ہے ، کسی نے اپنے نسخے پر کسی وجہ سے لکھا اور بعد میں

(۱) ملاحظہ ہو: ماتمس إلیه الحاجة: ۳۴، و أسماء الرجال: ۱۰۱، و الرفع و التکمیل: ۱۲۱۔۱۲۶، مع تعلیقات الشیخ عبدالفتاح، نیز ''آثار السنن ''از : نیموی '' قواعد فی علوم الحدیث ''از : تھانویؒ

وہ اصل کتاب کے اندر لے لیا گیا ہے، متعدد حضرات نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ عبارت الحاقی ہے(۱) اور یہی بات دیگر اکابر علماء سے بھی منقول ہے۔

۲- میزان کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ بکثرت ابن عدی کی رائے من وعن نقل کردی گئی ہے، جب کہ ابن عدی کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر اس راوی کو لیا جائے، جس کے حق میں جرح موجود ہو، خواہ کوئی ہو؛ اس لیے میزان میں ثقہ ومعروف رواۃ کے حق میں اگر جرح ہو تو گو اس پر ذہبی کا کام ہے؛ مگر اس کی مزید تحقیق وتفتیش

۳— میزان میں محققین صوفیاء اور معتبر اولیاءِ امت کے حق میں کافی نقد وتبصرہ آیا ہے، اس میں بھی دیگر اعتدال پسند حضرات کی تائید ورائے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اس کو قبول نہیں کیا جائے گا؛ لیکن محققین اہل نظر نے وضاحت کی ہے کہ امام ذہبیؒ کا نقد انہیں لوگوں پر ہے جو غلط کار و گمراہ اور بازاری تصوف والے تھے، ورنہ انہوں نے اپنی کتابوں میں جگہ بہ جگہ حسن ظن کا اظہار کیا ہے۔ (۴)

۴— میزان پر حافظ ابن حجر کا کام بہت اہم ہے، اسی طرح ''تہذیب التہذیب'' بھی؛ مگر اصل تہذیب میں حافظ ابن حجر نے جو تصرف کیا ہے کہ بہت سے تراجم کم کر دیئے ہیں تو ان میں خصوصیت سے حافظ نے بعض ممتاز فقہاء ومحدثین جو امام ابوحنیفہؒ یا ان کے اصحاب میں سے کسی کے شاگرد ہیں اور اس کی وجہ سے ان کو امام ابوحنیفہؒ اور فقہ حنفی سے

(۱) تقریب وتہذیب وغیرہ کے خصائص وامتیازات کے لیے ''خلاصة التذهيب'' پر شیخ عبدالفتاح کے مقدمہ کے ساتھ مولانا تقی الدین ندوی کی علم رجال الحدیث ملاحظہ کی جائے۔

(۲) الرفع والتكميل: ۲۱۰-۲۱۱، وما بعد: ۳۳۹، و ما بعد، أسماء الرجال: ۱۰۰

(۳) تدريب الراوي: ۱/۱۰۷

(۴) الرفع و التكميل: ۳۱۰، و ما بعد تا: ۳۲۰، مع تعلیق الشیخ عبدالفتاح، شیخ نے اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے شواہد پیش کیے ہیں۔

انتساب ہے، ایسے حضرات کے تذکرہ کو حذف کر دیا ہے؛ اسی لیے علامہ انور شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ رجالِ حنیفہ کو جس قدر نقصان حافظ صاحب نے پہنچایا ہے کسی نے نہیں پہنچایا، (۱) حافظ ابن حجر کے متعلق یہ بات معروف ہے کہ وہ حنفیہ کے حق میں کمزور یا مغلوب تھے، اس لیے ان کے ممتاز اور مخصوص شاگرد علامہ سخاویؒ کا جملہ معروف ہے کہ ''حنفیہ کے حق میں ہمارے شیخ کی رائے معتبر نہیں ہے'' (۲) اور یہ حق ہے کہ '' كل يؤخذ منه ويترك ، إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم '' بسا اوقات آدمی ان چیزوں میں غلطی پر ہونے کے باوجود معذور ہوتا ہے۔

اخیر میں گذارشات یہ ہیں کہ جب کسی کام میں پوری دلچسپی سے لگو تو یہ احساس ہوا کرتا ہے کہ جو کام ہو چکا ہے وہ اگرچہ بہت ہے اور تحقیقی ہے؛ مگر پھر بھی کام کے کچھ پہلو اور بعض ضرورتوں کا احساس سامنے آتا ہے؛ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ کی تہذیب وتقریب سے بہت سے کام بنتے ہیں؛ مگر پھر بھی کئی ضرورتوں کا احساس ہوتا ہے :

(الف) تقریب کے انداز پر ایسی کتاب جس میں صحاحِ ستہ کے علاوہ معروف متون، جن کا سلسلہ خصوصیت سے امام بیہقی تک چلا ہے، ان متون کے رواۃ کو لیا جائے۔

(ب) تقریب وخلاصہ مختصراً کافی معلومات فراہم کرتی ہیں؛ لیکن ایسے کام کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو دونوں سے کچھ زیادہ وسعت رکھتا ہو، ظاہر ہے کہ ''تہذیب الکمال'' اور ''تہذیب التہذیب'' کا معاملہ تو بہت لمبا ہے اور پھر تقریب وخلاصہ انتہائی مختصر ہیں کہ دسیوں سطروں اور کئی صفحات کی جگہ ایک دو سطر پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے، ایک کام ایسا ہو، جو چند سطروں کی حد تک پھیلا ہو اور مزید ضروری معلومات اس میں لے لی جائیں، ممکن ہے کہ قدیم کوئی کام اس انداز کا موجود ہو تو اس کی بھی تحقیق واشاعت کی ضرورت ہے۔

(۱) أسماء الرجال: ۹۰-۹۱ (۲) مقدمه أماني الأحبار: ۴۸، اس میں سخاوی کی ''درر کامنة'' سے نقل کیا ہے: لا يستطيع أن يترجم لحنفي إلا باخسا لحقه و منتقصا لشأنه

(ج) صحاحِ ستہ کے ثقات اور ضعیف رواۃ پر الگ الگ تالیفات: یہ کام تقریب کی بنیاد پر آسان ہے اور فہرست کے انداز پر بھی اس طرح ہوسکتا ہے کہ ثقات کی فہرست الگ اور ضعیف رواۃ کی الگ ہو اور ہر ایک کے نام کے سامنے تقریب و تہذیب وغیرہ کے صفحات کا حوالہ بھی دے دیا جائے، تاکہ بہ سہولت مفصل و مبسوط کتابوں سے مراجعت کی جاسکے، نیز رجالِ حدیث اور رجالِ اسلام کا ایک جامع انڈکس بھی ایک اہم ضرورت ہے۔

